ایک چار میل سی

ایک چادر میلی سی

ناولٹ

راجندر سنگھ بیدی

LONDON BOOK
(Private) LT
Tariq Road, KARACHI.

نیا ادارہ، لاہور

آج شام سورج کی ٹکیہ بہت ہی لال تھی ۔ آج آسمان کے کوئلے میں کسی بے گناہ کا قتل ہو گیا تھا اور اس کے خون کے چھینٹے نیچے بکائن پر پڑتے ہوئے نیچے تلوکے کے صحن میں ٹپک رہے تھے ۔ ٹوٹی پھوٹی کچی دیوار کے پاس ، جہاں گھر کے لوگ کوڑا پھینکتے تھے ، ڈبو منہ اٹھا اٹھا کر رو رہا تھا ۔

دوپہر کے قریب بڑی ذیل کے کارندے جب کتوں کو گولی ڈالنے کے لیے آئے تو ڈبو بچ گیا ۔ وہ تلوکے کے ہاں کہیں صحن میں پڑی گھڑونچی کے نیچے سو رہا تھا ؛ اوپر ملتانی مٹی کے گھڑے رس رہے تھے اور نیچے کچی زمین کو ٹھنڈا اور خوش بودار بنا رہے تھے ؛ اور ڈبو اس ٹھنڈک اور بو باس سے پورا فائدہ اٹھا رہا تھا ۔ تھوڑی دیر میں وہ اٹھ کر اکڑا ، منہ کھول کر جمائی لی اور پھر باہر چلا آیا ۔ جب تک اس کی چہیتی کتیا بوڑی کی آنکھیں کاٹ چکی تھیں ۔ بوڑی کے پاس پہنچ کر ڈبو نے اسے ایک دو بار سونگھا اور پھر اچانک ایک سمت چل دیا ، جیسے کوئی بات ہی نہیں ۔ تلوکے کی بیوی رانو اور اس کی پڑوسن چنوں ، ایک دوسری کا منہ تکنے لگیں ۔ چنوں نے اپنی کوکے والی ناک پر انگلی دھری ، پھر ایک

لمبی سانس بھری اور بولی :

" ہا ! مرد کی جات - سب ایک ہی سی ہوتی ہے ۔"

رانو کی غلافی آنکھیں پھڑ پھڑا رہی تھیں ، جیسے کوئی کپڑے کو دھو بنا کر چھنڈ رہا ہو - پھر کچھ سنبھلتے مگر آنکھیں پونچھتے ہوئے رانو نے چنوں کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی :

" انیے ! تیرا ڈبّو تو ایسا نہیں ؟"

اس پر چنوں نے رانو کو ایک مردوں والی گالی دی جس سے وہ خود ہی شرما کر اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی - رانو بھی اندر پہنچ کر کام کاج میں جا لگی - شام کے وقت جب وہ رات کی آہ اور دن کی واہ کا کوڑا پھینکنے کے لیے باہر آئی تو دوپہر کے سارے واقعات بھول چکی تھی - جس ہاتھ سے اس نے کوڑا پھینکا اسی سے جھاڑو چھنڈتے ہوئے وہ منہ اٹھا اٹھا کر رونے والے ڈبو کو بھگانے لگی :

" ہات ! ہات مُردے ! یہاں دھرا ہی کیا ہے تیرے رونے کو ؟ رونا ہی ہے تو جا سامنے چوہدریوں کے گھر جا کر رو ، جہاں دولت کے ڈھیر ہیں ، مردوں کی لام لگی ہوئی ہے ۔"

چوہدری مہربان داس کے ساتھ رانی کو خدا واسطے کا بیر تھا - شاید اس لیے کہ تلوکے ، رانی کے گھر والے کو

بدمعاشی کی لت مہربان داس کے ہاتھوں لگی تھی ۔ پھر گاؤں کی عورتوں کی عجیب بات — اپنے مرد کا کچھ پتا نہیں ، دوسریوں کے مردوں کا کھایا پیا سب معلوم ۔ رانو اپنے تلوکے کے بارے میں جب نواب اِکے والے یا گورداس کی بیوی سے سنتی تو جل بھن کر راکھ ہو جاتی ۔ شاید راکھ نہیں کوئلہ ! کیوں کہ اندر سے رانو بہت پکی تھی ۔ تلوکا گھر لوٹتا تو وہ اس سے لڑتی ، اُسے نوچتی کاٹتی اور پھر خود ہی مار کھاتی ہوئی ایک طرف جا بیٹھتی اور سوچتی : ' ایک طرح سے اچھا ہی ہے جو باہر ہی غصہ نکال آتا ہے اپنا — میرے جی کا جنجال تو نہیں ہوتا ۔'

ان ، صرف ان باتوں سے رانو کو تلوکے کے مرد ہونے کا پتا چلتا اور وہ ایک ضد کے ساتھ اسے اپنا بنانے کی کوششوں میں لگ جاتی ۔ کوششیں کیا ؟ لنڈے پیپل کے نیچے ایک سائیں بابا تھا — جتی ستی ! جس کے بارے میں مشہور تھا کہ اس نے لوہے کا لنگوٹ پہن رکھا ہے اور اب تک نہیں جانتا عورت کیا چیز ہے ؟ حالانکہ چوبیس گھنٹے ، آٹھوں پہر اس کے گرد عورتوں ہی کا جمگھٹا رہتا : کوئی بیٹا مانگتی کوئی اٹھرا کی دوائی ۔ اکثر تو اپنے مردوں کو بس میں کرنے کے ٹوٹکے ہی پوچھنے آتیں ۔ ابھی کچھ ہی مہینے ہوئے اس نے پورن دئی مصرانی کو ٹوٹکا دیا جس سے نہ صرف وہ پیٹ والی

ایک چادر میلی سی

ہو گئی بلکہ گیان چند ، اس کا مرد ، باگلوں کی طرح اس کے ارد گرد چکر کاٹنے لگا ۔ رانو بھی تلوکے کی مار سے بچنے کے لیے باوا ہری داس سے ایک ٹونا لے آئی اور اس تاک میں لگ گئی کہ کب تلوکا کچا دودھ مانگے اور وہ ٹونے کو اس میں گھول کر پلا دے اور پھر پاس نہ آنے دے ۔ ہاگ ، جب منتیں کرے ، پاؤں پڑے ، ناک رگڑے ۔ تب ! لیکن ہفتوں تلوکے نے کچا دودھ مانگا نہ پیا ۔

تلوکا روز نہیں تو دوسرے تیسرے روز مٹھے مالٹے کی ایک بوتل چوہدری مہربان داس کے ہاں سے لے آتا تھا ۔ رانو دنیا بھر کے عیبوں کو معاف کر سکتی تھی لیکن شراب کو نہیں ۔ وہ سمجھتی تھی شراب ایسی سوت نہیں ۔ دنیا میں مرد چاہے اپنا سب کچھ کسی دوسری پر لٹا آئے پھر بھی اس کا کچھ نہ کچھ تو اپنے لیے بچ ہی رہتا ہے ، لیکن شراب ؟ ہاں ری ماں ! اس سے تو اتنی ہو آتی ہے کہ انسان منہ بھی قریب نہیں کر سکتا ۔ یوں معلوم ہونے لگتا ہے جیسے اپنا تو کچھ بھی نہیں رہا ، سب ہی کچھ لٹ گیا ۔ تلوکا دن بھر نواب ، اسمعیل ، گورداس وغیرہ کے ساتھ اِکا ہانکتا لیکن شام کے وقت نصیبوں والے اڈے پر جا کر اس تاک میں کھڑا ہو جاتا کہ کوئی بھولی بھٹکی سواری مل جائے اور وہ اسے اچھے کھانے ، نرم اور گرم بستر کے لالچ میں لے جا کر مہربان داس

کی دھرم شالہ میں چھوڑ دے۔ دراصل تلوکا یہ سب مہربان اور اس کے بھائی گھنشیام ہی کے لیے کرتا تھا ، لیکن اس پر بھی بدنامی اس کی اپنی ہوتی تھی۔ اس کے حصے میں آتی بھی تھی تو ایک آدھ چانپ اور مٹھے مالٹے کی بوتل!

کوٹلہ جاترا کی جگہ تھی ۔ چوھدری کی حویلی کے بازو میں دیوی کا مندر تھا جو کبھی بھیروں کے چنگل سے بچتی بچاتی اس گاؤں میں آ نکلی تھی اور اس جگہ ، جہاں اب ایک مندر کھڑا تھا ، گھڑی دو گھڑی بسرام کیا تھا اور پھر بھاگتی ہوئی جا کر سامنے سیال کوٹ ، جموں وغیرہ کی پہاڑیوں میں گم ہوگئی تھی ۔ اب بھی کسی ڈھلی ہوئی صبح کو کوٹلے سے شمال مغرب کی طرف دیکھا جائے تو دور ، افق پر کسی ڈاچی کا کوہان سا نظر آتا ہے — وہی ویشنو دیوی کا پہاڑ ہے ۔

تلوکے نے آج جس جاترن کو مہربان داس چوھدری کی دھرم شالہ میں چھوڑا وہ مشکل سے بارہ تیرہ برس کی ہوگی ۔ دیوی کے پاس تو اپنے آپ کو بچانے کے لیے ترشول تھا جس سے اس نے بھیروں کا سر کاٹ کر الگ کر دیا ، لیکن اس معصوم جاترن کے پاس صرف دو پیارے پیارے گلابی سے ہاتھ تھے جنھیں وہ بھیروں کے سامنے جوڑ سکتی تھی ، ان سے مدافعت نہ کر سکتی تھی ۔ پھر بدن — جیسے تربوز کے گودے کا بنا ہوا ، جو مہربان کی چھری سے بچ نہ سکتا تھا ۔ شاید اسی

ایک چادر میلی سی

لیے اس دن کا سورج غصے میں لال اپنے رتھ کے گھوڑوں کو اِدھر چھالٹا ، اُدھر چابک ، اُدھر چھالٹا ، اِدھر چابک لگاتا ہؤا سامنے خانقاہ والے کنوئیں کے پاس ، فارم کی کپاس کے پیچھے کہیں گم ہو گیا تھا اور اُوپر آسمان پر دوج کے نازک سے چاند کو نچڑنے ، پیلا ہونے کے لیے چھوڑ گیا ۔

دھرم شالہ کے پاس ٹھیکے والوں کے مکان کی نئی ٹیپ ہوئی تھی ۔ سیاہیوں کے پرے دیواروں کے چہرے پہ چھٹ چکے تھے ۔ اینٹوں کا گیروا تو دکھائی نہ دیتا تھا البتہ ان کے بیچ کا چونا اتنے اندھیرے کے باوجود سامنے ہنستا ، منہ چڑاتا ہؤا نظر آ رہا تھا ۔ پُروا میں کوئلے کے سہارے پھروانہہ ، جامن اور بکائن سنسنا رہے تھے اور جوہڑ کے کنارے باوا ہری داس والے لنڈے پیپل کے گِنے چُنے پتے ایک بے ہنگم سی آواز پر تال دے رہے تھے ۔ جس راستے پر تلوکا جا رہا تھا وہ گاؤں کے ایک ہی بازار ، اور بازار میں ایک ہی آٹے والی دکان کے سامنے سے ہو کر جاتا تھا جہاں اتفاق کی بات ، ایک ہی عورت : جھلم ارین — اپنی ترکاری دے کر اس کے بدلے گیہوں لے رہی تھی ۔ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے تلوکے نے آواز دی :

"کیوں جھلمیں — پھر کیا مرضی ہے ؟"

گاؤں بھر میں ایسے آوازوں کی عادی ، غریب کی جُورو

سب کی بھابی ، جہلم نے تلوکے کی طرف مڑ کے بھی نہ دیکھا اور جھولی اناج سے بھرتی ہوئی بولی : "جو تیری ماں کی ہے ، تلوکا ! ہائے تجھے پیدا ہونے سے کسی نے نہ روکا ؟"

— اور تلوکا ہنستا ہؤا نکل گیا ۔

گھر پہنچا تو اس کے جڑواں بیٹے ابھی تک بکائن کے نیچے کوئلے سے لکیریں ڈال آپس میں بارہ گٹال کھیل رہے تھے ۔ ایک نے غلط ہی دوسرے کی کنکری مار لی اور مہا بھارت شروع ہو گئی ۔ وہ بنا سمجھے بوجھے بڑوں کی ٹھیٹ زبان میں ایک دوسرے کو گالیاں دینے ، بال نوچنے لگے ۔ باپ کی آہٹ پاتے ہی ایک دم اپنے اپنے اردو کے قاعدے لیے دیے کی روشنی میں بیٹھ گئے ۔ ادھر باپ نے آواز دی : " پڑھو اوئے پڑھو ۔" اِدھر بڑے بچے نے پڑھنا شروع کیا : "وہ دیکھو الو بولا ۔"

تلوکے نے معاملہ فہمی کے انداز میں کہا : " میں سب جانتا ہوں ، حرامیو ! " جس پر چھوٹا زور زور سے کہنے لگا : " بک بک مت کر ، بک بک مت کر ۔" اور تلوکا اس نئی تعلیم کو ایک نا قابلِ علاج بیماری سمجھ کر سٹک گیا ۔

ان جڑواں بچوں ، بنتے اور سنتے سے بڑی پھلونٹی کی ایک لڑکی تھی جس کا نام تلوکے اور رانو نے ہمیشہ کی سہولت کے لیے بڑی ہی رکھ دیا تھا ۔ وہ دن بھر کام کاج میں ماں کا ہاتھ بٹاتی اور جب کچھ نہ ہو تو سب سے چھوٹے ،

سال بھر کے چھوں کو کھلانے لگتی : " ویر آیا کھیل کے ، میں من پکاواں ویل کے ۔" وہ محلے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ گیند بھی کھیلتی جب بھی وہی بھیا اور وہی بھابی :

" کوٹھے آتے گنا ، ویر میرا لمبا

بھابو میری پتلی ، جہڑے لک مچھلی ۔"

اور ایسی ہی آس پاس کی چیزیں : گنا ، ویر ، بھابی ، ناک کی مچھلی ، لنڈا پیپل ، توریاں ، جیٹھ — اس کی کائنات ابھی جیٹھ کے تصور تک ہی پھیلتی تھی ، لیکن ابھی سب کچھ مبہم مبہم ہی تھا ؛ البتہ گھر میں ایک اور تھا جو تیزی سے سمجھ دار ہو رہا تھا : بڑی کا چاچا ، تلوکے کا چھوٹا بھائی ، رانو کا دیور — منگل — بے کار اور بدکار ؛ دن بھر اسے چھیڑ ، اُسے چھیڑ ، بار بار اپنے تہبند کو کس ؛ گھر آتا تو یوں کھانا مانگتا جیسے سب اسی کی کمائی کا ہو ؛ اور بھابی رانی اندر سے خوش باہر سے غصے میں کہتی : " دیتی ہوں مشٹنڈے ! تیرے ہی لیے تو سب پکا ہے ۔"

منگل پانچ چھ برس کا بچہ تھا جب تلوکا رانو کو بیٹھے ، اس کے مائیکے سے لایا ۔ رانی کے ماں باپ بے حد مفلس تھے ۔ شاید اسی لیے انھوں نے چیتھڑوں میں لپٹی ہوئی اپنی بیٹی کا نام رانی رکھ دیا تھا ۔ جب وہ بڑی ہوئی ، بھری تو روٹی کپڑے کے وعدے پر اس کے ماں باپ نے اس کا ہاتھ تلوکے کے ہاتھ میں

دے دیا اور خود عدم آباد کی طرف نکل گئے ۔ رانو کو اس بات کا بڑا دکھ تھا کہ اس کا آگا تو جیسا تیسا بھی ہے لیکن پیچھے کوئی نہیں ۔ کبھی تو ایسا وقت آ جاتا ہے جب ہر عورت گر کر پیچھے دیکھتی ہے اور جو نہ دیکھ سکے تو اسے آگے بھی نظر نہیں آتا ۔ رانی جب سے کوٹلے میں آئی تھی اسے ماں کے روپ میں ساس جنداں مل گئی اور باپ کی شکل میں مسر حضور سنگھ ، اور دیور منگل ، جو اتنا چھوٹا تھا کہ بڑی کے پیدا ہونے پر اس کے ساتھ دودھ پینے کے لیے مچل گیا ۔ کچھ ہنستی ، کچھ شرماتی ہوئی رانو نے اکیلے میں جب اسے پاس بٹھا کر کرتے میں سے چھاتی نکالی اور اس کی طرف بڑھائی تو وہ بھاگ نکلا ۔ منگل کو رانی ہی نے پالا ۔ دنیا کی نظروں میں وہ اس کا دیور تھا لیکن رانی کی نگاہوں میں اس کا سب سے بڑا بچہ ۔ منگل بھی رانی کو اپنی ماں ہی سمجھتا تھا ۔ ورنہ وہ سگی ماں کو تائی کیوں کہتا ؟ جبھی تو رانی اس کے کان بھی اینٹھ لیتی تھی ، دھول دھپہ بھی کر لیتی ۔ لیکن اب پچھلے چند برسوں سے دنیا ہی بدل گئی تھی ۔ نہ صرف بچے بڑے ہو گئے بلکہ منگل بھی آنکھیں دکھانے لگا اور تلوکا شراب پینے اور جنداں روایتی ساس کی شکل اختیار کرتے ہوئے بات بات پر کاٹنے لگی ۔ اس کی اصلی وجہ تو یہ تھی کہ آمدنی کے راستے مسدود ہو گئے تھے ۔ اِدھر تلوکا ہفتے میں دو تین

دن گھر میں ہی پڑا رہتا ، اُدھر حضور سنگھ کی آنکھوں میں موتیا بند اتر آیا اور وہ ہمیشہ چارپائی پر بیٹھا کانوں سے دیکھنے کی کوشش کرتا اور اس کی آنکھوں کے پپوٹے صبح جوہڑ میں نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑ پھڑاتے رہتے ۔

چھٹی کے دن ایک روز شام کے قریب تلوکے نے رانو کے پاس جا کر اپنے اریب اریب کرتے کی جیب میں سے ایک ٹماٹر نکالا اور اسے رانی کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا : " لے ، ایک پیاز ڈال کے کاٹ دے اسے ۔"

رانی ، جو ترکاری پکا رہی تھی ، تھم گئی ۔ ہاتھ کی کڑچھی دیگچی میں ڈالتے ہوئے وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی ، بولی : " پھر لے آئے میری سوت کو ؟"

"تلوکے نے جھینپتے ہوئے کہا : " روز تھوڑے ہی ہوتا ہے رانو ؟"

" روز ہو یا نہ ہو ، " رانی کڑک کر بولی ، "میں نہ پینے دوں گی ۔ کہاں ہے تمہاری بوتل ؟ آج میں دیکھ تو لوں اس میں کیا ہے جو مجھ میں نہیں ؟"

تلوکا اس بات سے ڈر رہا تھا کہ شور نہ مچے ، لیکن رانو نے وہی بات کی ۔ دانت پیستے اور جھلاتے ہوئے تلوکے نے ایک نامردانہ سی کوشش کی : " کتیے ! کنجرے ! میں تجھ سے باگ کھینچ کر بات کر رہا ہوں اور تو ہے کہ چھوٹتے ہی

ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو گئی ۔"

" ہاں " ، رانی بولی ، "بے شک گھوڑے پر تو ہی سوار ہو سکتا ہے ، دوسرا نہیں ؟ آج میں اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گی ، آج اس گھر میں یہ رہے گی یا میں رہوں گی ۔"

اور رانو بوتل ڈھونڈنے دوڑی ۔ آناً فاناً تلوکے کی آنکھ کا پانی مر گیا ۔ اس نے بھاگتی ہوئی رانی کو اس کے اڑتے ہوئے بالوں سے پکڑ لیا اور ایک ہی جھٹکے میں اس کا پٹڑا کر دیا ۔ دیے کی لو ایک بار بجھنے کے قریب ہوئی اور پھر سیدھی ہو کر کانپنے لگی ؛ بکائن پر بیٹھے ہوئے تلیر اڑ گئے ؛ ڈبو تن کے کھڑا ہو گیا اور پھر کچھ نہ سمجھتے ہوئے بھونکنے لگا ؛ بڑی چچلائی : " باپو !" بچے اندھیرا ڈھونڈنے اور چھپنے لگے : ایک تو موقع پا کر گھر سے بھاگ گیا ، دوسرا ایک کونے میں جا لگا ، دہشت کے عالم میں کانپتا ہوا وہ ماں کی بجائے "آں آں" کہہ رہا تھا ؛ حضور سنگھ چارپائی پر سے لپکا ، فریاد کے سے انداز میں گالیاں دیتا ہوا : " اوئے باپیا ، اوئے بے شرما ! اوئے بے حیاوا " ۔ اور تنور پر گر کر جھاس گیا ۔

پہلے ہلے میں رانی برابر آئی ۔ اس نے اپنی بتیسی تلوکے کے ہاتھ میں گاڑ دی ۔ تلوکے نے اور غضب ناک ہو کر اسے بار بار دیوار کے ساتھ مارا اور وہ گالیاں دیں جو اس نے کبھی اپنے جانور کو بھی نہ دی ہوں گی ۔

" مار ڈالا ، ماں کو مار ڈالا ۔" بڑی چلا رہی تھی، اور جب دادی باہر سے آئی تو بڑی کی شلوار گیلی ہو چکی تھی ۔ جنداں آتے ہی بولی : " جانتی تھی ... میں جانتی تھی ایک دن یہ چاند چڑھنے والا ہے ... ہائے یہ پٹری واسوں (خانہ بدوشوں) کی اولاد ! جانے کہاں سے ہمارے گھر میں آ گئی ؟"

" تو بیچ میں مت بول ۔" منگل ماں سے کہہ اٹھا ۔ وہ میاں بیوی کی لڑائی میں کسی کا بھی آنا ٹھیک نہ سمجھتا تھا اور ایک طرف کھڑا اپنے آپ کو روکنے کی اور سمجھانے کی پوری کوشش کر رہا تھا ۔

"کیوں نہ بولوں ؟" بڑھیا بکے جا رہی تھی ، " اپنی کمائی سے پیتا ہے ، اس کے باپ کینے سے تو مانگنے نہیں جاتا ؟ خود تو کھپ گیا ، یہ کنج (چیل) چھوڑ گیا ہمارے لیے ۔"

ماں کی شہ پا کر تلوکا اور بھی تند ہو گیا ۔ اس نے رانی کے کپڑے پھاڑ دیے اور اسے یوں کر دیا جیسے ابھی پیدا ہوئی ہو ۔ وہ زور زور سے چلا رہا تھا : " نکل جا ! نکل جا میرے گھر سے !"

رانو بے دم سی ہو کر کہے جا رہی تھی : " میں نہیں رہوں گی ، میں آپ نہیں رہوں گی ۔" کچی دیوار کے پاس کچھ اجنبی سے چہرے آمڈے ، اوپر کوٹھے پر کچھ عورتوں کے سائے سے رینگے : " مار ڈالا ، اڑیو مار ڈالا — ہائے نی کوئی بچاؤ —

ھائے نی یہ راکھشش ۔"

۔ ایسی ھی آوازیں آ رھی تھیں ؛ سبھی آوپر کلیجہ تھامے کھڑی تھیں ؛ نیچے آنے ، رانو کو چھڑانے کی ھمت کسی کو نہ پڑتی تھی ۔ جب ھی کوٹھے کوٹھے ھوتی ھوئی جھلم ارین ، اس کی بیٹیاں ، پورن دئی برھمنی ، نواب کی بیوی عائشہ ، چنوں ، ودیا ، سروپو ۔ سب ھی پہنچ گئیں ؛ لیکن ان سب میں صرف چنوں چلا رھی تھی : "چھڑاؤ وے ، وے کوئی چھڑاؤ ۔"

"کھبردار جو کسی نے چھڑایا ۔" رانو آوپر دیکھتے ھوئے چلائی ، "تم سب جاؤ ... جاؤ تم ... کیا تم کو نہیں پڑتیں ؟" اور پھر بولی ، "آج جو ھونا ھے ھو جانے دو ایک بار ۔ آج دیوی کے کوٹلے میں بڑا پن ھو گا ۔ آج میں اس کے ھاتھوں مروں گی ، سورگ کو جاؤں گی ؛ آج میرے بچے مجھے روئیں گے ۔"

۔ رانو عورتوں کو بھگا رھی تھی ، بلا بھی رھی تھی ۔ کہاں تو منگل ایک ضبط کے عالم میں سب کچھ دیکھ رھا تھا اور کہاں اب ایکا ایکی لپک کر اس نے بڑے بھائی کا ھاتھ پکڑ لیا اور موٹی سی ماں کی ایک گالی دیتے ھوئے بولا : لا ۔ اب لا ھاتھ نیچے ، کہ ایک عورت ھی پر ختم ھو گئی شہ‌زوری؟ ھلو ۔ ھل اب ، اپنے باپ کا ھے تو !"

تلوکے نے منگل کی آہنی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی ، کچھ بولنے بکنے لگا لیکن منگل کی نگاہوں میں قتل دیکھ کر خاموش ہوگیا - منگل نے اسی پر بس نہ کی ، آگے بڑھ کر اس نے زور سے بوتل کو ٹھوکر ماری اور وہ ٹوٹ گئی - شراب کی بو لپکی اور منڈیر پر کھڑی عورتیں چھی چھی کرتی ، ناک پر کپڑا رکھتی ہوئی پیچھے ہٹ گئیں اور کچھ دیر کے بعد چلی گئیں - پھر تلوکے کو یوں ٹھس ہوتے دیکھ کر منگل نے خود ہی اسے چھوڑ دیا اور وہ – تلوکا – بکتا جھکتا ہوا اندر کوٹھڑی کی طرف چل دیا - اب اس کی گالیوں میں پتھر نہیں بنولے تھے جو ہولے ہولے دماغوں پر الگ رہے تھے - ان میں پہلی سی بے تکلفی نہ تھی - اب یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ زبان سے نہیں کسی کتاب سے پڑھ کے سنا رہا ہے -

رانو اندر جا کر ایک ٹرنک میں کپڑے ڈالنے لگی - وہ جا رہی تھی - کہاں جا رہی تھی ؟ یہ اسے بھی معلوم نہ تھا - وہ بس جا رہی تھی : ' بیٹی تو کسی دشمن کے بھی نہ ہو بھگوان ! ذرا بڑی ہوئی ، ماں باپ نے سسرال دھکیل دیا ؛ سسرال والے ناراض ہوئے ، مائیکے لڑھکا دیا - ہائے یہ کپڑے کی گیند ! جب اپنے ہی آنسوؤں سے بھیگ جاتی ہے تو پھر لڑھکنے جوگی بھی نہیں رہتی -"

کپڑے تھے ہی کتنے ؟ پل بھر میں ٹرنک تیار ہو گئی اور

پھر ایک دم رانو کوٹھڑی سے باہر نکل آئی ۔ خود روتی ، دوسروں کو رلاتی ہوئی بولی : " لو جی سنبھالو اپنا گھر ۔ یہاں ایک میں ہی مہمان تھی ناں ، سو جا رہی ہوں ۔ تم لے آنا کسی اور کو جو کرے مرے بھی اور تمہاری گالیاں بھی سنے، مار بھی کھائے اور ہڈیاں بھی تڑوائے ۔" پھر رانو کو سامنے بچے نظر آ گئے ، غم اور غصے میں اندھی ہو کر جنہیں وہ بھول ہی چکی تھی ۔ " بچے ؟" وہ خود ہی بول اٹھی ، " میں سمجھوں گی پیدا ہی نہیں ہوئے ۔ سمجھوں گی مر گئے ۔"

بڑی نے پاس آ کر دوپٹے کا پلو تھامتے ہوئے کہا : " ماں !" رانو نے ایک دم جھٹکے سے پلو کو چھڑا لیا اور بولی : " پرے ہٹ مردے ! ایک دن تیرا بھی یہی حال ہوگا ۔"

اور وہ باہر کی بہت ہی وسیع و عریض دنیا کی طرف چل دی ۔ اندھیرے کے کارن آسمان کے تاروں کے سوا اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا ۔ اُدھر ایک ایک ستارہ اپنی زمین جتنا بڑا تھا اور کئی زمین سے بھی بڑے جو سامنے کھڑے آنکھیں جھپک رہے تھے ۔ بیچ میں کالی بدلی آ جانے کی وجہ سے دوج کا چاند دو بھانک ہو چکا تھا ۔

منگل نے بھاگتے ہوئے رانو کا بازو تھام لیا اور بولا : " بھابی ! کہاں جائے گی ؟" اور پھر دہشت کے عالم میں پیچھے

ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا : " اسے روکو تائی ۔"

جنداں ہاتھ جھٹکتے ہوئی بولی : " جائے گی کہاں ؟ آگا نہ پیچھا ۔"

حضور سنگھ چلایا : "دھیے ! رانیے !" اور پھر اندازے ہی سے اس کی طرف لپکتے ہوئے ، پاس پہنچتے ہوئے اپنی پیٹھ پر سے کرتا اٹھا لیا اور وہ چھالے، جو تنور پر گر کر جھلس جانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے، دکھاتے ہوئے بولا : "میرا پنڈا تو دیکھ بیٹا ۔"

رانو اُبل پڑی ۔ منہ پر دوپٹہ لیتے ہوئے بولی : " ہاہو !" جب تک تلوکے کا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا ۔ ایک یتیم لا وارث کی طرح وہ اندر سے آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا اور اُکھڑی سی آواز میں بولا : " جا ... جا نہ...دیکھتا ہوں کہاں جاتی ہے ؟"

"کہیں بھی جاؤں ، تجھے اس سے کیا ؟ " رانی روتے ہوئے بولی : " جہاں بھی جاؤں گی محنت مجوری کر لوں گی ، اپنا پیٹ بھر لوں گی ۔ دو روٹیوں کے لیے مہنگی نہیں کسی کو ۔ گاؤں بھر میں کوئی جگہ نہیں میرے لیے ، دھرم شالہ تو ہے ..."

دھرم شالہ ! تلوکا چونک اٹھا ۔ ایک دم آگے بڑھتے ہوئے اس نے رانی کی ٹرنکی پکڑ لی اور بولا : " چل — مر پیچھے ۔"

پیچھے ؟ — آگے ؟ — رانو ، خوددار رانو بہت کچھ چھینی جھپٹی لیکن تلوکے کی طرح اب اس کی باتوں میں بھی کوئی دم نہ رہ گیا تھا ۔ وہ کوئی بہانہ ھی چاھتی تھی جس سے وہ بھی رہ جائے اور عزت بھی ۔ اور اب جانے کا فائدہ بھی کیا تھا ؟ ہوتل تو ٹوٹ ھی چکی تھی !

ماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا: "اسے روکو تائی۔"

جنداں ہاتھ جھٹکتے ہوئی بولی: "جائے گی کہاں؟ آگا نہ پیچھا۔"

حضور سنگھ چلایا: "دفعے! رانیے!" اور پھر اندازے ہی سے اس کی طرف لپکتے ہوئے، پاس پہنچتے ہوئے اپنی پیٹھ پر سے کرتا اٹھا لیا اور وہ چھالے، جو تنور پر گر کر جھلس جانے کی وجہ سے پڑ گئے تھے، دکھاتے ہوئے بولا: "میرا پنڈا تو دیکھ بیٹا۔"

رانو ابل پڑی۔ منہ پر دوپٹہ لیتے ہوئے بولی: "بابو!"

جب تک تلوکے کا نشہ بھی ہرن ہو گیا تھا۔ ایک یتیم لا وارث کی طرح وہ اندر سے آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا اور آ کیڑی سی آواز میں بولا: "جا... جا نہ...دیکھتا ہوں کہاں جاتی ہے؟"

"کہیں بھی جاؤں، تجھے اس سے کیا؟" رانی روتے ہوئے بولی: "جہاں بھی جاؤں گی محنت مجوری کر لوں گی، اپنا پیٹ بھر لوں گی۔ دو روٹیوں کے لیے مہنگی نہیں کسی کو۔ گاؤں بھر میں کوئی جگہ نہیں میرے لیے، دھرم شالہ تو ہے..."

دھرم شالہ! تلوکا چونک اٹھا۔ ایک دم آگے بڑھتے ہوئے اس نے رانی کی ترنکی پکڑ لی اور بولا: "چل — مر پیچھے۔"

(۲)

حضور سنگھ کے جلتے ہوئے بدن پر رال لگا کر رانو لوٹ آئی ۔ تلوکا ٹانگیں پھیلائے پڑا کچھ سوچ رہا تھا ۔ سونے سے پہلے ننھا ایک بار رویا لیکن ماں کے چھاتی منہ میں دینے کے بعد وہ خاموش ہو گیا ۔ تلوکے کے دماغ میں آج کے ہنگامے کی بجائے وہ جاترن گھسی ہوئی تھی ، اور رات بھر گھسی رہی ۔ اندھیرے میں وہ خود مہربان داس تھا اور رانو جاترن ۔ تلوکے نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو رانو نے جھٹک دیا ۔

" ہی ، بچی ! بالکل بچی ! " تلوکے نے کچھ کھسیانہ ہو کر کہا ، " تو تو بالکل ایک بارہ تیرہ برس کی بچی کی طرح کرتی ہے ۔ ویسے ہی دولتی جھاڑنے لگتی ہے ۔"

پھر تلوکا منت سماجت پر اتر آیا ۔ وہ بھی ان مردوں میں سے تھا اندھیرا ہوتے ہی جن کی ساری اکڑ جاتی رہتی ہے ۔ پھر اس نے اٹھ کر شیوجی کی تصویر نکالی جس میں وہ پاروتی کو پاس بٹھائے ہوئے تھے اور سر کی جٹاؤں میں سے گنگا بہہ رہی تھی ۔ رانو کے پاس تصویر رکھ کر تلوکے نے شیوؤں کا واسطہ دیا ، پاروتی کے امر پیار کی باتیں کیں ، لیکن رانو اپنی جگہ سے نہ ہلی ۔ پھر اس نے رادھے کرشن کی تصویر چوکھٹے

میں سے نکال لی - وہ چوکھٹے سمیت بھی لا سکتا تھا ، لیکن وہ ہر تصویر کو چوکھٹے میں سے نکالے دے رہا تھا ، جیسے وہ پیے ہوئے ہو یا ایسے ہی اس کے دماغ میں کوئی فاسد مادہ اڑ گیا ہو - کچھ دیر بعد چوکھٹے ہی چوکھٹے رہ گئے، تصویریں بیچ سے غائب ہو گئیں -

رانو صبح اٹھی تو اس کا عضو عضو درد کر رہا تھا - وہ اٹھنا نہ چاہتی تھی ، لیکن گھر کا سارا کام کاج پڑا تھا - شام کو کسی نے کچھ نہ کھایا تھا اس لیے روٹی کی بھی جلدی تھی ؛ پھر گھوڑے کے لیے دانہ بھگونا ، اس کا ساز نکالنا تھا - تلوکا ہمیشہ کی طرح ادھ مؤا پڑا تھا ، آنکھیں بھی آدھی کھلی آدھی بند ، منہ پورا کھلا ہؤا - رانو اس کے پاس سے اٹھ کر دیے کے پاس گئی اور اسے ھاتھ میں لیے پھر تلوکے کے پاس چلی آئی — اسی جذبے سے جس سے انسان مرے ہوئے سانپ کو دیکھنے کے لیے لوٹ آتا ہے -

جب تلوکا اٹھا تو رانو گھر کا آدھا کام کر چکی تھی - اسے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کل شام کچھ ہوا ہی نہیں ، اس کے ھاتھوں سے ساز لیتے ہوئے تلوکے کے ماتھے پر پھر سے تیوری چڑھ گئی - اسے دیکھنے پر بھی یہی معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ ہؤا ہی نہیں ؛ رات اس نے معافیاں مانگی تھیں نہ کان پکڑے تھے اور نہ ناک سے زمین پر لکیریں کھینچی

تھیں - یوں بھی سورج کی کرنوں کے ساتھ ہی اس کی مردانہ اکڑ لوٹ آئی تھی - ساز کے تھامتے ہی اس کے گھنگرو چھن چھن کر اٹھے - گھوڑی کی پروں والی کلغی میں ہوا کی ایک لہر دوڑ گئی اور تلوکا بولا : "یہ نہ سمجھنا میں تجھ سے ڈر گیا ہوں -"

"میں کب کہتی ہوں ؟" رانو نے ٹالتے ہوئے کہا -

تلوکا اس پر بھی چپ نہ ہؤا : "عورتوں سے وہ ڈرتے ہیں جو نامرد ہوتے ہیں - آج پھر لاؤں گا مٹھے مالٹے کی بوتل ، دیکھوں گا تو کیسے روکتی ہے ؟"

رانی کچھ نہ بولی ، البتہ دل ہی دل میں اس نے سوچا : 'آج یہ لایا مٹھے مالٹے کی بوتل تو میں گلے کی ہولدلی چبا لوں گی ؛ بارہ سنگے کا پورا سینگ پیٹ میں گھولپ لوں گی ؛ کتے کی گولی کھا مروں گی جو اس دن بوڑی نے کھائی تھی - پھر یہ کینہ بھی ڈبو کی طرح ایک نظر مجھے دیکھ کے چھوڑ دے گا - ایک آدھ دھاڑ تو مارے گا ہی ، میرے لیے نہیں تو اپنے بچوں کی خاطر - نہیں نہیں ، کسی کا کیا جائے گا ؟ مر جائے گی ماں باپ کی بیٹی - پر ماں باپ کہاں ہیں ؟ آگا نہ پیچھا ! میں نہیں مروں گی - ساس خوش ہو گی ، کہے گی : 'سستے ہی میں جان چھوٹی -'

جب ہی منگل اپنے البیلے پن میں پاس سے گزر گیا - بھائی کے

ایک چادر میلی سی

پاس پہنچا تو دونوں مغائرت کی نظر سے ایک دوسرے کو دیکھنے ، غرانے لگے ۔

" تیار ہو گیا ہے پٹھا ۔" تلوکے نے کہا اور خود ہی دم دبا کر اندر بھاگ گیا ۔

منگل نے کوئی جواب نہ دیا اور باہر نکل گیا ۔ بڑی ماں باپ کو ایک دوسرے کے قریب آتے دیکھ کر صحن کی طرف سٹک گئی اور چھوٹے بھائیوں کو مدرسے کے لیے تیار کرنے لگی ۔ دوسری کوٹھڑی میں رات بھر کراہتا ، جاگتا ہؤا حضور سنگھ کہیں پچھلے پہر سو گیا تھا ۔ جنداں دبی زبان میں جپ جی کا پاٹھ کر رہی تھی ۔

کچھ دیر کے بعد اِکا سواریوں سمیت گھر کے سامنے کھڑا تھا اور رانو ہمیشہ کی طرح چار موٹی موٹی روٹیاں ایک میلے، روغن میں بسے ہوئے کپڑے میں لپیٹ کر تلوکے کو دے رہی تھی ۔ رانو نے ایک نظر اِکے کی طرف دیکھا جہاں بارہ تیرہ برس کی ایک لڑکی کچھ ہوش اور کچھ بے ہوشی کے عالم میں بیٹھی تھی اور چودھری مہربان داس کے کاسے اسے تھامے ہوئے تھے اور شہر لے جا رہے تھے ۔ رانو نے حیرانی سے پوچھا : " کون ہے ؟ کیا ہؤا اسے ؟ "

" مرگی ! " تلوکے نے جواب دیا ۔ وہ گھوڑے کی پیٹھ کا بکاس لگا رہا تھا ۔

" رانو نے ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا : "مرگی ؟"

" ہاں ! " تلوکا بولا ، " مرگی — جو ہر عورت کو پڑتی ہے ۔ رات تجھے بھی تو پڑی تھی — اور جس کا علاج جوتا ہے ۔" اور پھر اندر طاق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا : " یا وہ چھانٹا جو میں آج لوٹ کر تجھ پر توڑوں گا ۔ کل ہی نتھو نے اس پر شام چڑھائی ہے ۔"

رانو کی ٹانگیں کانپنے لگیں ۔ تلوکے کے جاتے ، نظروں سے غائب ہوتے ہی اس نے پہلا کام یہ کیا کہ چھانٹے کو طاق پر سے اٹھا کر اندر بھنڈارے میں لے گئی اور اسے بھڑولی میں گیہوں کے نیچے — بہت نیچے — کر کے چھپا دیا ۔

ابھی دوپہر بھی نہیں ہو پائی تھی کہ سامنے ، شاملات کی طرف سے کچھ آدمی دوڑتے ہوئے آئے جن میں نواب اور اسمعیل ، اِکے والے ، بھی تھے ۔ گیان چند ، پورن دئی کے شوہر ، اور دیوانا ، چکی کے مالک ، کے پاس پہنچتے ہوئے نواب نے کہا : " اوئے پنڈتا ! سنا تو نے ؟ " اور پھر اپنا منہ پنڈت کے کان کے پاس کر کے کچھ کہا اور پھر سب مل کر چہ‌میگوئیاں کرنے ، تلوکے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے ۔ جب ہی جہلم کا داماد ، مراد بخش ، دکان پر سے ایک ہاتھ میں ترازو اور دوسرے میں دوسیری پکڑے ہوئے آیا اور شاہی جاٹ کو خانقاہ والے کنویں پر جانے سے روکنے لگا ۔ پھر اس نے شاہی

کے قریب ہوتے ہوئے کچھ کہا اور آخر وہ بھی دوسروں کے ساتھ مل کر تلوکے کے گھر کی طرف دیکھنے لگے۔ رانو دروازے میں کھڑی ان سب کے دیکھنے کو دیکھنے لگی۔

چنوں، جو رانو سے رات کی صلح کے بارے میں پوچھنے آئی تھی، اسے جھنجھوڑ رہی تھی: "بتا، بتا پھر کیا ہؤا؟"

رانو نے اس کی توجہ سامنے ہونے والی سرگوشیوں کی طرف دلائی، اور بولی: "ہائے نی! آج ان مردوں کو کیا ہؤا ہے؟ سب کے سب اسی طرف دیکھ رہے ہیں۔"

"ہاں!" چنوں نے دیکھتے ہوئے کہا: "جانتی ہے کیوں؟"

"کیوں؟"

"رات مار کھا کے، ہڈیاں تڑوا کے تو اور بھی نکھر گئی نا۔"

"رنڈیے، کھسم کھانیے!" رانی نے چنوں کو چوٹی سے پکڑتے، کھینچتے ہوئے کہا اور پھر دونوں ایک دوسرے کے کولہوں میں چھپے دینے، کلکاریاں مارنے لگیں۔

رانو کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب اس نے چودھری مہربان داس اور اس کے بھائی گھنشیام کو ہتھکڑیاں لگے بازار میں سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ لیکن ساتھ اٹھارہ انیس برس کا ایک

نوجوان لڑکا بھی تھا جس کے کپڑے خون سے تر بتر تھے۔ اس کے منہ، سر— ہر جگہ پر خون ہی خون دکھائی دے رہا تھا اور وہ کچھ ہوش، کچھ بے ہوشی کے عالم میں حوالدار جہان خان اور نمبردار تارا سنگھ کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔ مہربان داس کا رنگ ایک دم سیاہ ہو جانے سے اس کے کانوں میں پڑی لنتیاں چمکنے لگی تھیں۔ گھنشیام کے ماتھے پر بڑے بڑے لیل دکھائی دے رہے تھے اور صافہ یوں گلے میں پڑا تھا جیسے اسے باندھنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو اور یا پھر لڑائی جھگڑے میں کھل گیا ہو۔

"شکر ہے،" رانو بولی، "میں تو آج گڑ بانٹوں گی چنی! ہر کسی کے ہنسنے کی بجائے یہ آج سرکار کے جنوائی بنے ہیں۔"

چنوں نے کوئی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو نے ناچتے اور تالیاں بجاتے ہوئے کہا: "میں تو آج ناچوں گی، گدھا ڈالوں گی۔" اور پھر دروازے ہی سے مندر کے کلس کی طرف دیکھتے، اس کی طرف ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بول اٹھی: "شکر ہے دیوی ماں! آج تو نے سن لی میری۔ آج کا دن تو دھنیہ ہو گیا میرے لیے۔"

جب ہی تلوکے کا اِکا دکھائی دیا، لیکن اسے گورداس چلا رہا تھا: "ہائے نی!" رانو نے چنوں سے کہا اور پھر اسی طرف دیکھنے لگی۔

اِکے کے اندر کوئی لیٹا ہؤا تھا ۔ رانو نے سوچا : ' شاید اس مرگی والی لڑکی کو کچھ ہو گیا ہے ؟' پھر سب سواریاں مل کر اس لڑکی کو اتارنے لگیں ۔ جب اسے پاس لائے اور اس کے منہ پر سے کپڑا ہٹایا گیا تو رانو ایک دم چلائی : " نہیں ۔" اور پھر اندر کی طرف بھاگ گئی اور چنوں سر اور چھاتی پیٹتے ہوئے اپنے گھر کی طرف ۔

تلوکا قتل ہو گیا تھا ! خانقاہ والے چاہ کے قریب اس نوجوان جاٹن کے بڑے بھائی نے اسے پکڑ لیا تھا اور اس کی شہ رگ میں دانت گاڑ دیے اور اس وقت چھوڑا جب اس کے بدن میں خون کا ایک بھی نمکین قطرہ نہ رہا !

جس وقت لوگوں نے اسے پکڑا وہ نوجوانِ وحشت کے عالم میں آنکھیں پھیلائے ، دونوں ہاتھوں کو اوپر اٹھائے ، مندر کے کاس کی طرف دیکھتا ہؤا ایک مذہبی غیض و غضب ، ایک جنون کے عالم میں چلا رہا تھا : " تیرے نمت ۔ ہے دیوی ماں ! تیرے نمت ۔" اور لوگ اِسے مارتے دھاڑتے ہوئے لے جا رہے تھے اور وہ ایک بلند آواز میں دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا :

" ماتا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں
میا رانی دے دربار جوتاں جگدیاں ۔"

ماتا رانی کے دربار میں جوتیں جل رہی ہیں ۔ میا رانی کے

ایک چادر میلی سی

دربار میں جوتیں جل رہی ہیں ! اور ان جوتوں کی چمک اس کی بھیانی ، کانچ ہوتی ہوئی آنکھوں میں چلی آتی تھی ۔ بیچ میں اس کا رنگ ایکا ایکی پیلا پڑ جاتا اور پھر ایک دم لال ، کیسری ہو اٹھتا ۔ جب ہی ہر لحظہ بڑھتے ہوئے لوگوں کے ہجوم کے ساتھ وہ مندر کے پاس پہنچ گیا ۔ پھر اس نے کود کود کے ، اچھل اچھل کے ، لپک لپک کے گانا شروع کر دیا :

" ہے میا ! تسیں ستے بھیناں گوریاں
سر لال پھلاں دیاں جوڑیاں
میا رانی دے دربار — جوتاں جگدیاں ۔"

اے میا ! تم ساتوں بہنیں گوری ہو ۔ تمہارے سر پر لال پھولوں کی جوڑی ہے ۔ اور وہ اپنے خون میں بسے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ نچوڑ کر لہو اپنے سر پر مل رہا تھا ۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دیوی کی روح اس میں چلی آئی ہے اور ایک انتقامی جذبے سے اپنا روپ کروپ اور آنکھیں آگ بھبھوکا کیے بھیروں یا تلوکے کی طرف دیکھ رہی ہے ۔

پھر وہ ڈنڈوت کے انداز میں مندر کے دروازے پر لیٹ گیا ، پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا ۔ لوگ ڈر سے کانپتے ہوئے اسے چھوڑ کر الگ ہو گئے ۔ وہ چاہتا تو اسی جنون کے عالم میں چلاتا ، بھینٹیں گاتا ہوا کہیں بھی نکل جاتا ، لیکن کچھ دیر بعد اس نے خود ہی اپنے آپ کو نمبردار تارا سنگھ کے حوالے کر دیا ۔

یہ بھی اس کے جنون ھی کا ایک حصہ تھا !

آس پاس کے پندرہ بیس گاؤں سناٹے میں آ گئے ۔ کوٹلے بھر میں کہرام مچ گیا ۔ بے موسمے بادلوں نے سورج کی آب و تاب کم کر دی اور وقت سے بہت پہلے اندھیرا چھا گیا ۔ ویشنو دیوی مندر کے کلس تلوکے کے گھر میں جھانکنے لگے ۔ بکائن نے پتیاں سمیٹ لیں اور ڈہبو نے رونے ، بھونکنے کی بجائے اپنی دم ٹانگوں میں سکیڑ لی ۔

حضور سنگھ کی آنکھوں میں پرماتما نے ایکا ایکی روشنی دے دی ــ بیٹے کی لاش دیکھنے کے لیے ! جنداں غش کھا کر دس بارہ گھنٹوں کے لیے بچوں کی چچلاھٹ سے گزر گئی ۔ رانو باھر دوڑی ، پھر اندر چلی آئی ، پھر باھر آٹھ دوڑی ۔ اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آ رھا تھا ۔ نہ معلوم کیوں اسے گھر کے سب زیور ، سب کپڑے پہننے کا خیال چلا آیا ۔ وہ یہ سب کرنے والی تھی کہ چنوں نے پکڑ لیا اور اس کے ھاتھ دیوار سے مار مار کر چوڑیاں توڑنے لگی ۔ پورن دئی باھر سے مٹی کی مٹھیاں بھر کر لائی اور رانو کے سر پر خالی کر دیں ۔ لیکن رانی اب تک کچھ نہ سمجھی ۔ وہ پھر اندر لپکی اور بھنڈارے میں جا کر گیہوں کے ڈھیر میں یوں ھاتھ مارنے لگی جیسے حاملہ کتیا ، چونہہ چونہہ ، کرتی ہوئی پنجوں سے زمین کے پڑے تک کھود ڈالتی ہے ۔ رانی نے وھی شام لگا چھانٹا نکال

لیا اور اسے لے کر باہر سب کے سامنے چلی آئی اور کسی الدھے جوش سے اسے تلوکے کو دکھاتے ہوئے توڑ دیا اور بولی : " لے میں نے توڑ دیا تیرا چھالٹا ۔ بڑا مجھ پر توڑنے آیا تھا !"

سب سمجھے رانی پاگل ہو گئی ہے ۔ رانی پاگل ہو گئی تھی اور نہیں بھی ۔ بڑی ، دیوار کے ساتھ کھڑی ، پہلے ہی چیخ پکار کر رہی تھی ، اس پر رانو نے اس کے پاس جا کر سر پر ایک دوھتڑ جڑ دیا اور بولی : " سب پہ گڑے پڑتے ہیں ، سب کو سیتلا نکلتی ہے ، سب مرتی ہیں ، ایک تو نہیں مرتی ۔" ودیا نے بیچ میں آ کر چھڑا لیا ۔ اس غریب کا کیا قصور تھا ؟ قصور کیوں نہیں ؟ کیوں وہ ایسے باپ کے گھر پیدا ہوئی تھی جو اس کا رھن چھڑائے بغیر ھی چلتا بنا ۔ پھر چوکھٹ پر کھڑی رانو کو ایک پل کے لیے خیال آیا : 'رو دے ' رو دے گشتیے ! نہیں تو جانے تجھ پر ہنسے گا ۔ ہنسے گا !" لیکن رونا تھا جو کسی طور نہیں آ رہا تھا ۔ ایکا ایکی رانو کو اپنے بھی کسی کے بھی معلوم ہونے لگے ، اپنا گھر کسی کا گھر ۔ وہ پھر الدر گئی تا کہ پیاز ھی کوٹ کر اس کا پانی آنکھوں میں ڈال لے اور رو دے ۔ رو دے ! آخر اس کی ضرورت نہ پڑی ۔ سامنے رکابی میں وہ ٹماٹر پڑا تھا جو تلوکا رات مٹھے سالٹے کے ساتھ کھانے کے لیے لایا تھا !

اب رانی کے بند ٹوٹے ۔ وہ رو رھی تھی ، بین کر رھی

ایک چادر میلی سی

تھی اور سر پر دوھتڑ مار رھی تھی اور گاؤں بھر کی عورتیں زار زار روتی ھوئی اسے روک رھی تھیں - رانی کے بینوں نے ساتوں آسمانوں میں چھید کر دیے - منگل چلا اٹھا : "ماں !" اور پھر دیواروں کے ساتھ اپنا سر پھوڑنے لگا - رانی چلا رھی تھی : " رانی بندیے ! تیرا پیچھا نہ آگا - ھائے رنڈیے ! تیری شکل تو اب باجاں بیٹھنے والی بھی نہیں ، اب تو تو پیشہ کرنے جوگی بھی نہیں -"

(۳)

چودھری مہربان داس ، اس کے بھائی گھنشام اور باوا ہری داس — سب کو سات سات سال قید سخت کی سزا ہوگئی تھی ۔ ساتھ جاتون کے بڑے بھائی ، اس لڑکے ، کو بھی اتنی ہی ، کیوں کہ لوگ مقتول کی لاش کو نمبردار تارا سنگھ اور حوالدار جہان خان کے پہنچنے سے پہلے موقع پر سے لے جا چکے تھے اور وکیل صفائی قاتل کے سلسلے میں ناگہانی اشتعال ثابت کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے ۔ لیکن باوا ہری داس کو اتنی لمبی سزا کیوں ؟ اسے اس لیے کہ اس کا لوھے کا لنگوٹ بوسیدہ سے کپڑے کا نکل آیا تھا ۔

باوا ہری داس کو ایسی عبرتناک سزا سن کر کوٹلے کی سب عورتیں چپ ایک دوسری کے منہ پر کچھ ڈھونڈنے لگیں ۔ پکڑی گئی تو پورن دئی براھمنی جو سب سے زیادہ باتیں کرنے کی عادی تھی اور جس کے منہ سے ایکا ایکی ' ھا ' نکل آئی تھی اور آنکھوں سے آنسو ۔ لوگ کہتے تھے جب تک گاؤں پر مندر کی چھتر چھایا ہے اور دیا دھرم والے لوگ ، جوھڑ کے کنارے آڑ کر آ بیٹھنے والے کبوتروں کو دانہ دنکا ڈالتے ہیں کوٹلے میں کوئی پاپ نہیں ہو سکتا ؛ ہوگا بھی تو اس کی پوری سزا

ملے گی جیسی کہ بھیروں کو ملی تھی۔

چودھریوں کی حویلی ، جائداد ، زمین وغیرہ سب مقدمے میں گئے ؛ دھرم شالہ پنچایت کے عمل میں چلی آئی ۔ اس سانحے کے بعد لوگ اتنے چوکنے ہو گئے کہ ان میں سے کسی کی بھی ہمت عورت کو سامنے سے دیکھنے کی نہ پڑتی تھی ۔ البتہ گاؤں کی گج گامنیاں جب اپنی مستی میں نکل جاتیں تو سب انھیں پیچھے کی طرف سے جاتے ہوئے دیکھتے اور نظروں سے ان کے اٹھتے ، گرتے کولہوں کے ساتھ تال دیتے اور کچھ دیر میں تال تک دینے کی ہمت نہ رہتی ۔

حضور سنگھ کی ہڈیوں تک میں پانی پڑ گیا تھا ۔ وہ چارپائی پر بیٹھا بڑھیا کی گالیاں سنا کرتا ۔ جنداں اسے ایک دن رو بیٹھنے کی منتظر تھی ۔ کوئی زمانہ تھا جب حضور سنگھ نے اس عورت کو راج کرایا تھا ، بڑے بڑے شہروں کے چڑیا گھر اور توتا محل دکھائے تھے ، لیکن اب وہ بے کار ، بے یار و مددگار گھر میں پڑا گرنتھ صاحب کے نویں محل کے شبد گنگنایا کرتا جو دلیا کی بے ثباتی کی تفسیر میں لکھے گئے تھے اور حضور سنگھ کو ایک عجیب طرح کا حوصلہ اور ہمت دیتے تھے ۔ جنداں رات دن کے چوبیس گھنٹے چکا کرتی ۔ رانی کو تو دیکھتے ہی بڑھیا کے بدن کے سارے تکلے کھڑے ہو جاتے اور وہ رانی پر اپنی گالیوں کے چھاجوں کے چھاج خالی

کر دیتی : " رنڈیے ! ڈائنے ! چڑیلے ! میرے بیٹے کو کھا گئی اور اب ہم سب کو کھانے کے لیے منہ پھاڑے ہوئے ہے - چلی جا - جدھر منہ کرنا ہے کر لے - اب اس گھر میں کوئی جگہ نہیں تیرے لیے -"

رانو ایک پل کے لیے بھی وہاں نہ رہتی ، لیکن پاپی من ، جو ایک جالے کی طرح بھوں کے ساتھ لپٹا ہوا تھا ، اسے کچھ بھی نہ کرنے دیتا - جتنا جنداں اسے گھر سے نکالنے کی کوشش کرتی اتنا ہی رانو اس کے پاؤں پکڑتی - زندگی میں یوں ایکا ایکی بے قیمت ہو جانے سے وہ تیزی سے ڈھلنے لگی - جو چیزیں اس کے بدن میں کم ہو رہی تھیں وہی ہڈی کے جسم میں بڑھنے لگیں - وہ پر پھیل — جنگل کے پھول کی طرح — اوپر ، نیچے ، دائیں ، بائیں — سب طرف بے تماشہ کھلنے لگی - کبھی اس پھول کی ایک پتی گر بھی جاتی تو اس کی جگہ دو اور نکل آتیں - اپنے آپ سے بے خبر وہ اچھلتی کودتی چاندنی رات میں لڑکوں کے ساتھ کھیلنے نکل آتی ؛ دیر سے گھر لوٹنے پر دھان کی طرح پھٹک دی جاتی لیکن اس پر جیسے کوئی اثر ہی نہ ہوتا - کچھ غریبی کی وجہ سے اور کچھ جان بوجھ کر رانو اسے پھٹے پرانے ، تیل اور بساند میں رسے بسے ہوئے کپڑوں میں رکھتی - بال بنانے کی بجائے بکھیر دیتی تاکہ اس پر کسی کی نظر نہ پڑے - بڑی گوری چٹی تھی اور پورو کے الفاظ میں

ایک چادر میلی سی

اس پہ کسی 'رنگیج' کی اولاد ہونے کا شبہ پڑتا تھا ۔ جب کوئی میلی نظر سے بڑی کی طرف دیکھتا تو رانو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتی اور پھر سب باتوں سے نپٹ کر پکار اٹھتی :

"گورا رنگ نہ دئیں وے ربا !
سارا پنڈ ویر پے گیا ۔"

گورا رنگ نہ دیجو پرماتما ! سارا گاؤں بیری ہوگیا ۔ رانو جتنا بڑی کو چھپانے کی کوشش کرتی اتنا ہی اس کا جوبن ان میلے اور بوسیدہ کپڑوں میں سے پھٹ کر سامنے چلا آتا ۔ وہ اس معصوم اور متحیر بچے کی طرح تھا جو باجے کی آواز سنتے ہی بے اختیار کھڑکی میں آ کھڑا ہوتا ہے ۔ بڑی کو یوں انجان اور بے خود دیکھ کر رانو سر ہلا دیتی اور کہہ اٹھتی : " اس بے باپ کی بیٹی کا انت برا ہے ۔ جس دن کسی دشمن کی اس پر نظر پڑ گئی یہ کہیں کی نہ رہے گی ۔" اور مارے ڈر کے رانو کانپنے لگتی ۔ اسے سیلان کی بیماری ہو گئی اور بدن کی چربی یوں گھلنے لگی جیسے تپتے توے پر مکھن کی ڈلی گھلنے ، پگھلنے لگتی ہے ۔

رانو کے حساب سے بڑی دن بدن اپنی تقدیر کی تاریخ کے نزدیک پہنچ رہی تھی ۔ پچھلے ماگھ کی سنکرانت سے رانو کو بڑی کے 'نہانے' کا حساب رکھنا پڑ رہا تھا ۔ کہیں دو دن بھی اوپر ہو جاتے تو رانو اس سے عجیب طرح کے الٹے سیدھے

سوال پوچھنے لگتی : " تیسرے پہر کو تُو کہاں تھی ؟ پھر ایشراں کے ہاں سے کہاں گئی ؟ مندر میں کون کون تھا ؟ کیوں تو پروہت سے گورو منتر لینے بیٹھ گئی ؟ جاتی بھی ہے یہ منتر تجھے کہاں پہنچائے گا ؟ بھول گئی باوا ہری داس کو ؟ " پھر وہ احتیاطاً گھر میں کاڑھا لا رکھتی — جھوٹ اور کفر کو اُبال پھینکنے کے لیے ۔ جب کہیں دھڑکتے پھڑکتے ہوئے انتظار کے بعد اس بلوغ کے بوٹے پہ کوئی نیا گل انار کھل اُٹھتا تو رانی کی جان میں جان آتی اور بڑی کو جلدی جلدی گھر سے نکال دینے کی سوچ میں لگ جاتی ۔ لیکن گھر میں تو بیس کوڑیاں نہ تھیں اسے رخصت کرنے ، اپنے گھر بھیج دینے کے لیے ۔ پھر رانو سوچتی : " وہ خود بھی تو روٹی کپڑے کے وعدے پر چلی آئی تھی ۔ لیکن پاپی پرماتما نے جب اس کی بہی کو زندگی کی مسرال میں بھیجا تو روٹی کپڑے کا بھی وعدہ نہ کیا ! گاؤں کے نوجوان لڑکے ، ہر دوسرے تیسرے شام ڈسکے جا کر سنیما دیکھنے والے حرامی ، بہن اور عورت میں بھی تمیز کرنے کے قابل نہ رہے تھے ۔ اتنا تو انہیں سمجھنا چاہیے تھا کوٹلے کی سب لڑکیاں ان کی بہنیں ہیں اور عورتیں مائیں ۔ اس پر بھی رانو ان میں سے کسی کے ہاتھ میں بڑی کا ہاتھ دے دیتی اور خود اس سارے حساب کتاب ، اس ڈر سے چھٹی پا لیتی ، لیکن وہ لُچّے ، بدمعاش — سب کے سب — مہر کرم دین

کے باغ میں سے کھٹے توڑ ، کچھ کھا کچھ پھینک کر بھاگ اٹھنے والوں میں سے تھے ۔ ان کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہ تھا ۔ جانے بڑی کی قسمت میں ویرو وال تھا یا ڈسکہ ؟ بڈھا گورایا یا جامکی ؟ یا دور لاہور ؟ پشاور ؟ رانو بیٹھی سوچ کے گزوں سے جدائیوں کے فاصلے ناپتی اور پھر ایک عجیب عمل سے کھینچ کھنچا کر انھیں سکیڑتی ، چھوٹا کر لیتی ۔ اس پر بھی اسے جھرجھریاں آتیں ۔ بڑی کی مدد سے وہ اس کے دھیج (جہیز) کا کشیدہ کاڑھتی ہوئی گنگنانے لگتی :

" سبھناں ساہورے چلنا ، سبھ سکلاوں ہار ۔"

ایک دن سب کو اپنی سسرال چل دینا ہے ۔ ایک دن سب کا گونا ہوگا ۔ لیکن اس کا اپنا گونا ؟ اس کی اپنی سسرال؟ جو اب مائیکہ ہو چکی تھی ۔ دماغ اور کشیدے کی اسی آدھیڑ بُن میں رانو یہ بھی بھول جاتی وہ گیت زندگی کا نہیں موت کا تھا !

پھر جیسے اپنے آپ ، ایکا ایکی رانو کی صحت ٹھیک ہونے لگتی ، بدن میں ایک عجیب طرح کا تناؤ پیدا ہو جاتا جو اس کے دماغ تک کی طنابیں کھینچ ڈالتا اور رانو کا من سسرال جانے کے لیے تڑپنے لگتا ۔ رانو جب سے کوٹلے میں آئی تھی تلوکے نے اسے سسرال کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہ دیا تھا ۔ سسرال نام ہوتا ہے سات پردوں میں لپٹی لپٹائی آنے والی دلہن کا ؛ اس کے سواگت کے لیے گھر کی چوکھٹ پر سرسوں کا تیل

کرانے کا ؛ سجھے باجوں کے نظروں کے ٹھٹھے کا ؛ ساس کے چاؤ ، سسر کے ملہار کا ؛ گانی کھیلنے ، برتن بدلنے کا ؛ منہ دکھائی اور پھر رات کو موتیا یا کرنے کے پھولوں کا ؛ دیے کی روشنی میں سمٹنے اور پھر ۔کھل جانے کا ؛ ایک بہیمیت کے ساتھ ساتھ ایک اتھاہ مادریت کا — لیکن تلوکا جہاں اسے ہر روز دلتا ، روندتا ہؤا لے جاتا تھا وہ تو سسرال نہ تھی جس میں ہر لڑکی شادی کے بعد جانا چاہتی ہے ! ہر عورت بیاہ کے برسوں بعد بھی جانا چاہتی ہے ! رانو ایکا ایکی سسرال اوز گونے کے لیے جاگ اٹھی ؛ لیکن سسرال اور گونا تو اس کی بیٹی کا ہونے والا تھا ۔ نہ معلوم اپنا یا بیٹی کا ! — بیٹی کا ! — اپنا ! — اور رانو کا وہی گیت ایک نوحے میں ڈھل جاتا ؛ جنداں کی گالیاں اور "در"در جسے اور دل دوز بنا دیتیں اور وہ گانے لگتی : " جچر "وسے سہیلڑی ، جچر ساتھی نال ۔" سہیلی اس وقت تک بس سکے گی جب تک ساتھی اس کے ساتھ ہوگا ۔ جسم اس وقت تک کام کرے گا جب تک روح اس کی رفاقت کرے گی ۔

اس پر وہ اوباش — منگل — اور وہی اس کا نصیبوں والا اڈہ ۔ منگل نے یکی پر ساز لادنا تو سیکھ لیا تھا لیکن خود پہ گھر کی ذمہ داری کا جؤا نہ پڑنے دیا ۔ آمدنی پہلے سے بھی کم ہو گئی ۔ زندگی میں ایکا ایکی چونک کر جاگا ہؤا منگل جذبات و شہوانیات کے جنگل میں کھو گیا ۔ ابھی وہ زندگی

کے سیاق و سباق سے اچھی طرح واقف نہ ہؤا تھا لیکن اسے
' جا اینجاست ' کا احساس ضرور تھا ۔ جب بھی کوئی کنواری
سامنے سے گزر جاتی تو جیسے اپنے آپ یہ بول اس کے ہونٹوں
پر چلے آتے :

" نشے دے بند بوتلے ! تینوں پین گے نصیباں والے ۔"

اے نشے کی بند بوتل ! تجھے نصیبوں والے پئیں گے ۔ اور
نصیبوں والے اڈے پر اِکا ہانکنے والا منگل یہ بھول ہی جاتا
گھر کی طرف سے بھی اس پر کوئی فرض عائد ہوتا ہے جہاں
سب لوگ اب ایک ہی وقت کھانا کھانے لگے ہیں ۔

انھی دنوں منگل کی جہلم ارین کی چھوٹی بیٹی — سلامتے
— سے راہ و رسم ہوگئی ۔ سلامتے نے نہ صرف ترکاری — بھنڈی ،
بینگن اور توری — ہی پر ہاتھ پیر نکال لیے تھے بلکہ اس کا
پورا بدن بیل پر لگی ہوئی لوکی کی طرح ہرا بھرا اور نرم تھا ۔
اس پر بھی وہ ہوا کے معمولی جھونکے کے ساتھ جامن اور بکائن
تو ایک طرف ، کانٹے دار ببول سے لپٹتی پھرتی تھی ۔ ایک دن
اس نے راہ جاتے منگل کو ٹوکا :

" اڑیا منگلا ! "

منگل ، جو اِکا لے کر نکل رہا تھا ، گھوڑی کی باگ
کھینچ کر رک گیا اور سلامتے کی طرف منہ اٹھا کر دیکھنے
لگا ۔ سلامتے نے پاس آ کر آنکھیں مٹکائیں اور بولی :

"ھائے ھائے وے الیاس ! ایک بار ھمیں بھی سیر کروا دے ۔"

"کیوں نہیں سلامتے !" منگل نے حامی بھری ، "گولی (باندی) کس کی اور گہنے کس کے ؟"

"کب کرائے گا ؟"

"جب تو کہے ۔"

"سلامتے آگے پیچھے دیکھ کر بولی : "آج ھی رات ۔"

"ھی" ، منگل نے کہا ، "میرا اِکا رات کو نہیں چلتا ۔"

اور وہ بـکی ۔ اپنی گھوڑی ۔کو چابک لگا کر چل دیا ۔ جب وہ ستراہ کے راستے پر دو تین کوس نکل گیا تب سلامتے کی بات کے معانی اس کی سمجھ میں آئے ۔ وہ گاؤں کی طرف مڑنے ھی لگا تھا کہ سواریاں الف ھو گئیں ۔ پھر یہ سوچ کر کہ ابھی تو رات ھونے میں آٹھ دس گھنٹے باقی ھیں وہ ستراہ کے راستے پر چل دیا ۔ گھوڑی کو چابک لگاتے اور کہتے ھوئے : "چل میری بکیے ، شہر و شہر ۔"

شام کو منگل گھر پہنچا تو اپنے اس چھوٹے سے دمشق کی قحط سالی دیکھ کر سارا عشق بھول گیا ۔ صبح سے کھانا نہ پکا تھا ۔ بڑی نے کچھ چاول اُبالے تھے ۔ لیکن بھوکی رانو نے انھیں طباق پہ ڈالا اور بنا نمک مرچ کے کھا گئی ، سوکھے ھی نگل گئی ۔ ساس سسر تو ایک طرف ، اس نے اپنے بچوں کو

بھی نہ پوچھا تھا اور اب جنداں اسے دھکے دے دے کر باہر نکال رہی تھی اور رانی پتھر بنی مار کھا رہی تھی ۔ وہ چاہتی تو ایک ہی ہاتھ سے بوڑھی جنداں کے جسم کا رشتہ اس کی روح سے علیحدہ کر دیتی لیکن وہ چپ تھی اور ایک آن جانے ڈر سے کانپے جا رہی تھی ۔ منگل اس منظر کو دیکھ کر ایک مجرمانہ احساس سے بکائن کے نیچے کھڑا ہو گیا ۔ آج اس نے صرف تیرہ چودہ آنے بنائے تھے جو گھر کے نون تیل کے لیے بھی کافی نہ تھے ۔ اسے اُلٹی طرف کی ایک سواری ملی تھی جو روپیہ سوا روپیہ دینے کو تیار تھی لیکن سلامتے کے لالچ میں وہ جلدی ہی گاؤں لوٹ آیا ۔

منگل نے جنداں کے ہاتھ روکتے ہوئے کہا : " تائی ! کیوں تُو روز اس گریب کے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے ؟ کیوں روز مارتی ، دھکے دیتی ہے ۔ آخر کہاں جائے گی بے چاری ؟"

رانو ، جسے اپنے شوہر کے مرنے پر رونا نہ آیا تھا ، ایک دم ہلک اُٹھی اور تھوڑی ہی دیر میں وہ اپنے آنسوؤں کے سیلاب میں کچھ یوں ڈوب گئی کہ لڑھکنے جوگی بھی نہ رہی ۔ وہ رو رہی تھی اور کہہ رہی تھی : "میں کیوں جاؤں؟ کیا نہیں کیا میں نے اس گھر کے لیے ؟ بیٹے نہیں جنے کہ بیٹی نہیں جنی ؟"

منگل بولا : " قصور بھابی کا نہیں ، میرا ہے ۔"

" تیرا خواہ مخواہ ہی ؟" جنداں کڑکی ، " جو عورت اپنے بچوں کی نہیں وہ اور کس کی ہوگی ؟" اور پھر رانو کی طرف منہ کرتے ، ہاتھ جوڑتے ہوئے وہ بولی : " گرو کے واسطے ، بھگوان کے واسطے ، دیوی ماں کے واسطے تو اب جا — دفان ہو جا - جو اندھا کانا ملتا ہے کر لے یہاں سے مر لے ..."

رانو اٹھی ، مڑتی ہوئی اس نے جنداں کو ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو : تُو تو جنی ہے ماں ! جگت ماتا ہے : تُو تو مجھے مت دھتکار - جیسے تیسے بھی ہے مجھے رکھ لے - میرا اس دنیا میں کوئی نہیں -" اور اسی ڈر سے وہ سب کے حصے کا کھا گئی تھی - اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس گھر میں رہے بھی تو کیسے ؟ بچے اب پل چکے تھے اور قاعدے سے وہ اب تلوکے کے تھے ، اس کے تھوڑے ہی تھے ؟ ساس ، سسر ، گاؤں میں پنچایت کے لوگ لے جانے بھی دیتے تو وہ ان کو لے کر کہاں جاتی ؟ خود بھیک مانگتی ؟ ان سے بھیک منگواتی ؟ پھر — ہنتا ، سنتا ، اور بڑی — ہر ایک سے وہ ایک ہی سا پیار کرتی تھی - اب بھی وہ اس کی دیکھ ریکھ کے محتاج تھے - ایک کو چھوڑنے کا خیال کرتی تو دوسری پسلی میں درد ہونے لگتا ! اور وہ سب اتنے چھوٹے نہ تھے کہ ساتھ لے جا سکتی ، اتنے بڑے نہ تھے کہ چھوڑ سکتی - ساس کے اٹھتے جوتا ، بیٹھتے لات کے عمل سے رانو بھی اب یہی

سمجھنے لگی تھی : جس عورت کا پتی مر جائے اسے اس سے گھر میں رہنے کا کوئی حق نہیں ۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر ایک صبح چنوں آئی اور گلے میں بانہہ ڈال کر اپنے گھر لے گئی ۔ ساگ کے ساتھ مکی کی روٹی کھلائی جو رانو نے اس ڈر سے تھوڑی کھائی کہ پھر نہ ملے گی اور پھر چنوں مونڈھا سرکا کر رانو کے پاس بیٹھ گئی اور بولی :"دیکھ بی بی ! میں تجھ سے ایک بات کہتی ہوں ، جو مانے تو ؟"

رانو نے چنوں کی طرف دیکھا ۔

چنوں شروع ہوئی : "یہ جنداں ہندی ، یہ ساس تیری تجھے جینے نہ دے گی ، اس گھر میں بسنے نہ دے گی ۔ یہاں رہنے کا ایک ہی طریقہ ہے ۔"

"کیا طریقہ ہے ؟ " رانو نے جاننے سے پہلے ہی ڈھارس پاتے ہوئے کہا ۔

" وہ یہ کہ تو ــ منگل سے شادی کر لے ، چادر ڈال لے اس پہ ۔"

" نہیں ۔" ، رانو ایک دم کھڑی ہو گئی ، یہ تو کیا کہہ رہی ہے چنوں ؟ "

" ٹھیک کہہ رہی ہوں ۔ جب بڑا بھائی پورا ہو جائے تو ۔"

" یہ نہیں ہو سکتا ۔" رانو نے کہا اور اس پہ ایک لرزہ چھانے لگا ، " منگل بچہ ہے ۔ میں نے اسے بچوں کی طرح پالا ہے عمر میں مجھ سے کچھ نہیں تو دس گیارہ سال چھوٹا ہے ۔ نہیں نہیں ، میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی ۔"

اور رانو گھر بھاگ گئی ۔

ایک چادر میلی سی

منگل ہکی کے لیے دانہ لے جا رہا تھا ، جب رانو گھر پہنچی۔ اندر جاتے ہوئے رانو نے مڑ کر ایک نظر منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا ایکی ، اپنے آپ "نہیں نہیں ...نہیں نہیں" کہتی ہوئی چل دی ۔ خود کو جھلنگے میں گرا ، منہ چھپا کر رونے لگی ۔

گھڑی بھر کے بعد منگل ساز لینے کے لیے اندر آیا ۔ آج وہ جلدی نکل جانا چاہتا تھا کہ گھر میں چاول ہی نہیں گیہوں بھی آئیں اور موٹی سی روٹی پکے جیسی کہ پکا کرتی تھی اور جس سے اصل میں پیٹ بھرتا تھا ۔ چاولوں کا کیا ہے ؟ وہ تو سیدھے پیشاب کے راستے سے نکل جاتے ہیں اور پھر پیٹ خالی ، رب والی ۔ ہو سکے تو ایک آدھ ترکاری بھی ہو جائے جس کے سواگت کے لیے منہ کی سڑک پر ابھی سے چھڑکاؤ ہونا شروع ہو گیا تھا ۔ کچھ نہ ہو تو روٹی کے ساتھ پیاز ہی سہی یا پھر لہسن کی کچھ تریاں ۔ ودیا کے ہاں سے لسی آ ہی جائے گی اور اس میں نمک اور لال مرچ ڈال کر روٹی کھا لی جائے گی ۔ ان سب باتوں سے زبان اور تالو مل کر ابھی سے چٹاخ چٹاخ کرنے لگے ۔ ایک ہاتھ سے ساز کا گورکھ دھندا سمیٹ کر منگل نے رانو کی طرف دیکھا اور بولا :

"کلغی کہاں ہے گھوڑی کی ؟"

رانو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھی ۔ پہلے تو اس نے سیدھے منگل کی طرف دیکھا اور پھر ایکا ایکی گھبرا کر دوسری طرف جھانکتے ہوئے بولی : "بھیے تو گئے مدرسے ۔"

منگل نے حیرانی سے رانو کی طرف دیکھا اور کہنے لگا :

"حد ہو گئی بھئی۔ میں چترمتری بکی کی بات کر رہا ہوں اور تو بچوں کی!" اور پھر یہ دیکھنے کے لیے کہ رانو کو ہؤا کیا ہے اس نے آگے بڑھ کر اسے چھو دیا۔ رانو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کھڑی ہو کر چلا دی:

"مت ہاتھ لگا مجھے۔"

منگل نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا اور اپنی انگلیوں کی پوروں کو دیکھنے لگا۔ پھر اسے کلغی مل گئی جسے ساز میں لگاتے ہوئے بولا: "اتنی سیانی، اتنی سمجھ دار ہو کر اب تک رات کی بات لیے بیٹھی ہے؟"

اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

رانو اٹھ کر دروازے تک گئی اور پیچھے سے منگل کو جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ کوئی دیر میں گلی کے نکڑ نے لپک کر منگل کو چھپا لیا۔ اب ہیر گاتے ہوئے اس کی صرف آواز آ رہی تھی:

"ہیر آکھیا جوگیا جھوٹھ بولیں، کون رُٹھڑے یار مناوندا اے
ایسا کوئی نہ ڈٹھا میں ڈھونڈ تھکی، جیہڑا گیاں نوں لیاوند اے"

ہیر نے کہا: اے جوگی! تو جھوٹ کہتا ہے۔ روٹھے یار کو منانے کون جاتا ہے؟ میں ڈھونڈتے تھک گئی، ایسا کوئی نہ دیکھا جو جانے والوں کو واپس لے آئے۔

(۴)

چنوں نے پورن دئی سے بات کی ؟ پورن دئی نے اپنے شوہر گیان چند سے ، جو گاؤں کا سر پنچ تھا اور اس وقت کوٹلے کی متنازعہ فیہ زمین کے ٹیلے ٹبے کھدوا کر ، نیچی زمین پر مٹی ڈالواتے ہوئے راستہ ہموار کر رہا تھا ۔ اس نے جورو سے منگل کے گھر کی حالت سنی تو بولا : " ہاں ، ہاں ٹھیک ہے ۔ رانی بیچاری اور کہاں جائے گی ؟" کیا کرے گی ؟ اور پھر کچھ سوچتے ہوئے بول اٹھا : " مگر منگل تو رانی سے بہت چھوٹا ہے ۔"

" تو کیا ہؤا ؟ " پورو بولی ، " اسے کون سی ہیر مل جائے گی ؟ گھر میں کھانے کو نہیں ، بدن پر کپڑا نہیں ۔ دونوں کا کام ہو جائے گا ۔ دونوں سکھی ہو جائیں گے ۔" اور پھر گاؤں کے سر پنچ کو ڈرانے کے لیے وہ کچھ اور بھی اپنے شوہر کے قریب چلی آئی اور کہنے لگی : " تم نے سنا سلامتے سے اس کا ؟ "

" نہیں نہیں — نہیں تو ۔"

" میں تو کہتی ہوں ان ارایوں ، ان مسلوں کو گاؤں سے نکال ہی دینا چاہیے ۔ یہ جہلم اور تینوں بیٹیاں اس کی ، جو بیاہی ہوئی ہے وہ بھی اور جو نہیں وہ بھی — سب ایسے گھومتی ہیں جیسے کتیا ..."

" تو کہے جائے گی ! مطلب کی بات بھی بتائے گی ؟ "
گیان چند نے بے صبری سے کہا اور بولا ، " کچھ ہؤا ؟ "

" ابھی تو کچھ نہیں ہاں ہو جائے گا ۔"

گیان چند کیا اُمید لے کر سننے آیا تھا لیکن سب مزا کر کرا ہوگیا ۔ وہ بولا : " کچھ ہؤا تو وہی حال ہوگا اس کا جو چودھری مہربان داس کا ہؤا ، بوڑھے کے لنگوٹ والے بابا ہری داس کا ہؤا ۔"

پورن دئی نے اپنی نظریں جھکا لیں ۔

گیان چند معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا : "مت یہ سمجھنا اب کے مقدمے میں صرف مرد ہی بھگتیں گے ۔ جب تک عورتیں برابر کا حق نہیں مانگتی تھیں ٹھیک تھا ، اب لیں برابری کا حق ۔"

" میں ایک بات پوچھتی ہوں ۔" پورن دئی نے کہا ، " تم نے جہلم کو دھرم شالہ میں کیوں بلوایا ہے ؟ " وہ اندر ہی اندر ہری داس کے نام کی جپ گھول رہی تھی !

" دھرم شالہ میں کہاں بلوایا ہے ؟ وہ تو مہر کرم دین کے باغ میں ..." گیان چند نے کچھ ہکلاتے ، پھر فوراً ہی راستہ پاتے ہوئے کہا ، " مسلمانی ہو کر وہ دھرم شالہ میں کیسے آ سکتی ہے ؟ "

" اچھا ! اب دھرم شالہ کی جگہ کرمو کے باغ نے لے لی ؟ "

" ارے نہیں ری سودائن ! اس نے باغ کے سب کیلے توڑ لیے ۔"

" تمہارے باغ کے تو نہیں توڑے ؟ "

" باڑ مضبوط تھی ۔" ، گیان چند نے مسکراتے ہوئے کہا :

" نہیں تو وہ کیا کمی کرتی ؟ "

" باڑ مضبوط تھی یا پہلے ہی آتے جاتوں نے توڑ لیے ؟ "

گیان چند کا چہرہ سیاہ پڑ گیا ۔ پورو سے نظریں بچاتے ہوئے وہ بولا : " اچھا ، اچھا ۔ تُو بات کرنے آئی تھی منگل کی ! "

" منگل کی نہیں ، رانی کی ۔" پورو نے تردید کی ۔

" رانی کی سہی ۔" گیان چند بولا ، " میں تو سمجھتا ہوں اسے منگل کے ساتھ چادر ڈال ہی لینی چاہیے ۔ یوں بھی گاؤں میں آئی ہوئی عورت باہر کیوں جائے ؟ اِدھر اُدھر کیوں جھانکے ؟ اس میں گاؤں کے ہم سب مردوں کی بدنامی ہوتی ہے ۔"

اور پھر مزدوروں کی طرف منہ کرتے ہوئے گیان چند نے بلند آواز سے کہا ۔ " کامیو ! گھبرو ! سب زمین برابر کر دو ، کہیں بھی اُونچ نیچ نہ رہے ۔"

اور تن آور جوان کسیّوں اور کدالوں سے کام میں لگ گئے ۔ ان کے جسموں پر تیل لگے ، کسے ہوئے پٹھے دور دور تک ہوا میں جلوتیاں مارنے ، روشنی میں چمکنے لگے ۔ اور گیان چند

سوچنے لگا : " ہمارے دیش پنجاب میں ، جہاں عورتوں کی کمی ہے ، کیوں مردوں سے ان کا حق چھینا جائے ؟ کیوں ایک عورت کو بے کار جلنے سڑنے دیا جائے ؟ پھر وہ گاؤں کی پنچایت سے الگ اور حضور سنگھ کی بھائیہ برادری سے الگ ملنے کے لیے چلا گیا ۔

منگل کی غیر حاضری میں کچھ لوگ بڑی کو دیکھنے آئے تھے ۔ بڑی معصوم کچھ نہ جانتی تھی ۔ دادی کے کہنے پر مہمانوں کی خاطر خدمت کے لیے دوڑ کر چنوں کے وہاں سے بڑی لے آئی جس میں ماوا کم تھا اور شکر زیادہ ۔ نفع گیر دکانداروں نے ایک سیر ماوے سے پانچ سیر برفی بنائی تھی اور شہر کی یہ بیماری گاؤں تک چلی آئی تھی ۔ وہ تین آدمی تھے: ایک ادھیڑ عمر کا تقریباً بوڑھا اور باقی کے دو جوان ۔ ایک تو صاف اس بوڑھے کا بیٹا معلوم ہوتا تھا اور دوسرا شاید اس کا دوست تھا ۔ ہو سکتا تھا بھائی ہی ہو ، لیکن شکل باپ پر نہ گئی ہو ۔ دادی کے اشارے پر وہ بڑی کو اٹھتے بیٹھتے ، اندر آتے باہر جاتے دیکھ رہے تھے ؛ نگاہوں سے تول رہے تھے ۔ نوجوان کی نگاہیں تو پھر اچٹ کر پڑتی تھیں لیکن بوڑھے کی سیدھی — اور جہاں پہنچتیں وہیں چپک جاتیں ۔ آخر جب بڑی نیچے گھڑے میں سے پانی ڈالنے کے لیے بیٹھی اور پھیلی تو بوڑھے نے منکارتے ہوئے کہا : " ہاں ! "

اور پھر بولا : " ٹھیک ہے ، سب ٹھیک ہے ۔"

اسی وقت بڑی کے ماتھے پر سے کسی خیال کی پرچھائیں گزری اور اس سے پہلے کہ دادی جنداں اسے باہر جانے کا اشارہ کرتی ، بڑی ایک ہی زقند سے باہر بھاگ گئی اور اپنے پیچھے ایک ایسی خوشبو چھوڑ گئی جو نوخیز لڑکیوں ہی کے بدن سے آتی ہے ۔

ہزار روپے سے آتے آتے ساڑھے پانچ سو پر فیصلہ ہوا ۔ اس پر جنداں کو سوچنے کا موقع دے کر اپنی تسلی تشفی کرتے ہوئے وہ لوگ چلے گئے ۔ حرافہ نے موقع بھی ایسا تلاش کیا تھا جب کہ رانو گاؤں کی دوسری عورتوں کے ساتھ کپاس چننے گئی تھی ۔ جنداں اب سوچ رہی تھی : " یہ رقم ان لوگوں سے لے گی کیسے ؟ لڑکی انہیں دے گی کیسے ؟ رانو سے تو پوچھنا ہی پڑے گا ! ، لیکن اسے تو وہ اپنے دل سے ، اپنے گھر سے ہمیشہ کے لیے بیگانہ کر چکی تھی ۔"

رانی لوٹی تو جنداں اسے لیہو پوتیاں کرنے لگی اور جب اسے پاس بٹھا کر جنداں نے اس کی بغل میں اپنی بوڑھی ، جھریوں ماری بانہہ ڈالتے ہوئے کہا : " تو جنم جنانتر کی بہو میری " تو رانو کا ماتھا ٹھنکا ۔ جب ہی بڑی نے باہر سے آتے ہوئے ماں کو اندر آنے کا اشارہ کیا جسے جنداں کی تقریباً اندھی آنکھیں نہ دیکھ سکیں ۔ رانو اٹھ کر اندر گئی تو بڑی نے اپنی

ٹھیٹ زبان میں ماں سے سب کہہ دیا - ساڑھے پانچ سو کی بات بھی سنا دی - وہ دروازے کے پیچھے سے سب سنتی رہی تھی -

رانو بڑی کے منع کرنے پر بھی ، لپک کر باہر چلی آئی - وہ اپنی اوقات ، اپنی ہمت ، اس گھر میں اپنا درجہ — سب کچھ — بھول چکی تھی ، وہ اس کڑک مرغی کی طرح تھی جو اپنے انڈے بچوں کو بچانے کے لیے شکرے اور باز پر بھی چھپٹ پڑتی ہے - " آج کون آیا تھا یہاں ؟ کس کی ہمت پڑی یہ دھلیز پھاندنے کی ؟ میری بیٹی کا سودا کرنے کی ؟ "

جنداں ایک ' نا عورت ' قسم کی مدافعت پر اتر آئی :

" نہیں دھیے ! رانیے ! وہ تو ایسے ہی بات کر رہے تھے - اب ہر کسی کا منہ تھوڑا پکڑا جا سکتا ہے ؟ "

" ہاں ! پکڑا جا سکتا ہے ، جھلسا جا سکتا ہے -"

رانو کوئی سن تھوڑے رہی تھی - ان حرام جادوں کی جبان کاٹ دینا تھی - منہ میں لٹ لٹ کرتا ہوا چو ٹھونس دینا تھا - میری بیٹی جس کی ایک ایک بانہہ ، ایک ایک انگلی ، ایک ایک پور لاکھ لاکھ کی ، اس کی ایک ایک تکنی (نظر) میں سو سو موکھاں (موکش) ؛ لوگوں کی ایک ایک نجر میں عمر قید -"

" تیری بیٹی ہے -" جنداں بولی ، " میری بھی تو کچھ ہوتی ہے ، میری بھی تو ہوتی ہے -"

" ہوتی بہو سے ہوتی ہے ، جب بہو ہی نہیں تو پھر ہوتی

کیسی ؟ "

اور پھر ایک لمبی سی گھسٹتی ہوئی " کھبردار کہتے ، ہاتھ لپکاتے ہوئے رانو اندر چلی گئی ۔ آخر وہی جھلنگا ، وہی رونا ۔ " ہائے اب میں بیٹی کو بکتے دیکھوں گی ؟ میں تو صرف کچھ لے کے نہیں آئی تھی تو یہ درّدشا ہوئی ، یہ تو بک جائے گی ! اور وہ بات بات پہ اس کی ہڈیاں توڑیں گے ، نوچ نوچ کے کھائیں گے ۔ کہیں گے : ' تجھے ایسے ہی تو نہیں خرید کے لائے ہیں ، دام دیے ہیں ' " تلوکے مرحوم کے زمانے میں آخری یہی حربہ تھا رانی کا : " دیا تو نہیں دیا ... لیا تو کچھ نہیں ۔ بیاہ کر لائے ہو کھرید کے تو نہیں لائے ؟ " — ' اور یہ بیٹی میری بک جائے گی ؟ ' گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ، بیاہ ہوگا بھی تو کیسے ؟ ' ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا ، ' آج مہربان داس چودھری ہوتا ، ایک ہی رات میں بیٹی کا جہیز تیار کر لیتی اور پھر اسے اپنے سامنے طوطیاں بجاتی ، ناچتی گاتی ہوئی برات ، سہرے باندھے ہوئے لڑکے کے حوالے کر دیتی اور جب ڈولی اٹھتی تو دور کھڑی دیکھتی ، روتی ، دیکھتی — لیکن کبھی نہ کہتی : ' بیٹی ! تیرے سہاگ کے لیے رات ایک ماں نے اپنا سہاگ لٹا دیا ۔'

' پھر پانچ ساڑھے پانچ سو ملیں گے تو یہ پھاپھاں مجھے کچھ دے تی تھوڑے ہی ؟ آخر بیچنا ہی ہے تو ایک ہی بار ساڑھے

پانچ سو میں کیوں ؟ کیوں نہ میں اسے لے کر شہر نکل جاؤں اور تھوڑا تھوڑا کرکے بیچوں ؟ لاہور میں سینکڑوں ہزاروں بابو لوگ پھرتے ہیں جو کچھ دیر کے دل بہلاوے کے لیے پندرہ پندرہ ، بیس بیس روپے دے جاتے ہیں ! کھانے کو چنگی چوکھی ملے گی ، پہننے کو ریشم ، کھین کھاب ۔ تھوڑے ہی دنوں میں روپوں اور کپڑوں سے صندوق بھر جائیں گے ۔'

جب ہی زنانے کے ایک تھپڑ کی آواز سنائی دی جو رانو نے خود ہی اپنے منہ پر مار لیا تھا ۔ اور اب ہمیشہ کی طرح ایک آن جانے خوف سے کانپنے لگی تھی ۔

جنداں رانو کا آخری فقرہ سوچ رہی تھی : ' ہوتی بہو سے ہوتی ہے ، جب بہو ہی نہیں تو پوتی کیسی ؟ ' اسی وقت گیان چند ، کیسر سنگھ ، جگو ، دُلا ، کرم دین اور گاؤں کے دوسرے آدمی چلے آئے اور آ کر حضور سنگھ کے پاس بیٹھ گئے ۔ جنداں کو بھی بلوا لیا اور رانی کے چادر ڈالنے کی بات یوں چھیڑ دی جیسے یہ بھی کوئی جھگڑا ہے جس کا فیصلہ پنچایت کو کرنا چاہیے ۔ چادر کی رسم کی بات شروع ہو گئی ۔ حضور سنگھ نے سمجھا : اس عمر میں ، جب کہ وہ مرنے کے قریب ہے ، پنچایت ، برادری کے لوگ اس کی بے عزتی کرنے ، اسے آخری ٹھوکر مارنے آئے ہیں ۔ لیکن جنداں عورت کی سریع العقلی سے یکایک بات کی تہ تک پہنچ گئی ، بلکہ اس سے بھی کہیں دور — آگے — بہت

آگے نکل گئی - ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا : اتنا نزدیک ، اتنے قریب کا خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا ؟ پھر اسے یاد آیا : ہاں ، ہاں ! آیا تھا - لیکن جب بڑی کتنی چھوٹی تھی - اب رانو پھر اس کی بہو ہو سکتی ہے اور بڑی اس کی پوتی ! اور جب حضور سنگھ نے پنچوں کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھڑپھڑائیں تو بوڑھی دانت نکال کر اس کی طرف بڑھی - ڈبو کی بوڑی مری تھوڑی تھی ؟ وہ تو زندہ تھی — جنداں ! جنداں بولی : " تو ، بیچ میں مت بولا کر ، بڈھے ! نہ مرے نہ جان چھوڑے ، جانتا بھی ہے کیا کیا انصاپھ ہو رہے ہیں اِس دنیا میں ؟ کہ اس جنم کا اندھا تو اگلے جنم کا بھی اندھا -"

پنچ موجود تھے جنھوں نے بڈھے بڈھی کا بھی فیصلہ کرا دیا اور آخر حضور سنگھ اور جنداں ، دونوں کی ، منظوری لے کر چلنے لگے - ان کے جانے سے پہلے ، بزرگ ہونے کے ناطے ، جنداں نے سب کو اشیرواد دی ، اِن سب کے پیٹھ موڑنے کی دیر تھی کہ رانی بھری ، بپھری ہوئی منظر پہ چلی آئی : " تُو تو بڑی کے بیاہ کی بات کرنے جا رہی تھی ، پھاپھاں ! بیچ میں یرا مردہ کیوں نکال بیٹھی ؟ " اور وہ بکے جا رہی تھی : " شرم ہے تو کچھ کھا مر - گھر میں بیسیوں ہولدلیاں پڑی ہیں راقر - ہے دیوی ماں ! یہ جوہڑ کے گدلے پانی میں ڈوب ڈوب مرے - اوپر سے آٹے والی مشین کُو کُو کرے - تُو میرے چموں

سے کیوں نہیں کر لیتی ؟ بنتے کے ہاں کیوں نہیں بیٹھ جاتی ؟ سنتے پہ کیوں نہیں چادر ڈال لیتی ؟ میں اس سے بیاہ کرنے جاؤں گی جسے میں نے چھاتی نکال نکال کر ..."

جب ہی کوئی ہاتھ رانی کے بالوں پر پڑا اور وہ اُلٹی ہوئی ، دیوار کے پیچھے ، کوڑے کے ڈھیر پر ، جا گری ۔ اٹھی ، نظریں صاف ہوئیں تو سامنے چنوں کھڑی تھی اور دانت پیس رہی تھی : " رنڈیے ، کھسم کھانیے ، ایدھر مر " اور پھر اسے مکان کے پیچھے ، کھولے ، میں ، جہاں گاؤں کے لڑکے لڑکیاں رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اور یا چور سیندھ لگاتے تھے ، لے جاتے ہوئے بولی : " ہم تیرے بھلے کی کریں کتیے ! اور تو پھیلتی جائے ؟ "

" نہیں چنوں ، نہیں ۔" رانو نے اس کے سامنے دکھڑا روتے ، پاؤں پکڑتے ہوئے کہا ، " وہ بھ ھے ، میں نے کبھی اسے ان نظروں سے نہیں دیکھا ۔"

چنوں بولی : " دیکھ ! تجھے اس دنیا میں رہنا ھے کہ نہیں رہنا ؟ اس پیٹ کا نرک بھرنا ھے کہ نہیں بھرنا ؟ اس اپنی شرم کو ڈھانپنا ھے کہ نہیں ڈھانپنا ؟ بڑی آئی ھے بخروں والی! کہا نہیں بلھے شاہ نے ؟ :

" بلھیا ! رب دا کیہہ پانا ؟
ایدھروں پٹنا ، اودھروں لانا ۔

بس اِدھر سے نکال کر اُدھر ڈال دینے کی بات ہے - پہلے اسے ان بخروں سے نہیں دیکھا تو اب دیکھ ، مردے ! "

رانو اپنے تصور میں منگل کو دیکھ رہی تھی !

چنوں بولتی چلی گئی : " سوچ تو موئیے ! دو شادیاں یہاں کس ماں جائی کو ملتی ہیں کرنے کو ؟ جس کے ساتھ ہو گئی سو ہو گئی - بیچ میں دو چار ہو جاتے ہیں ، لیکن وہ کوئی اچھی بات ہے ؟ ہر بکت ڈر سے جان نکلی رہے - ہاں ، مردوں کی بات الگ ہے - یہ دنیا ان کی — کوئی پوچھتا بھی ہے ؟ کوئی جو باہر سے آ کر تیرے منگل سے کرے گی ، تو کیوں نہ کرے ؟ سلامتی کی سنی ہے نا تو نے ؟ کھیر ، وہ سب باتیں چھوڑ ، تجھے اپنی بیٹی کا بیاہ بھی کرنا ہے کہ نہیں کرنا ؟ "

رانو پھر چونک گئی : " اپنا بیاہ کہ بیٹی کا ؟ اپنا ! "

وہ بچوں کی طرح ' نہ نہ ' کی ضد کرتے چلی گئی اور گھر پہنچ کر دن بھر بیٹھی سوچتی رہی ، سوچتی رہی - جب ہی ایک اور ہی آگ اس میں لپک آئی جس کا تعلق بڑی سے تھا نہ چھوٹے دو بچوں سے اور نہ چوں سے - کوئی اور ہی ناپید بچے اس کے پیٹ میں مچلنے لگے تھے -

شام کے قریب پورو آئی تو رانو بیمار پڑی تھی - ایک پٹی سی سر کے گرد کس کر باندھ رکھی تھی - بڑی چنوں موسی کے یہاں جا کر آٹے کی چڑیاں سی بنوا کر لے آئی تھی اور رانو

نے انھیں اپنی کنپٹیوں پر چپکا رکھا تھا اور وہ چڑیاں دانہ دانہ کرکے رانو کی ساری گرمیاں چن رہی تھیں ۔ پورن دئی نے تھوڑی مزاج پرسی کی اور پھر مسکراتے ہوئے کہا : "کیوں نی ! کیسا بکھار ہے ؟" اور رانو منہ موڑ کر مسکرا دی ۔

اس پر پوری کائنات ایک مخدوش سے طریقے پر کھل اٹھی ۔ پورو ہنسی ۔ بڑی کچھ نہ جانتے ہوئے بھی ہنسی کے اس اِکا دُکا موقع سے فائدہ اٹھا کر کھلکھلا اٹھی ۔ نہ معلوم کب اور کیسے سنتوں ، مہاتماؤں ، رادھے کرشن اور شو پاروتی کی تصویریں اپنے آپ چوکھٹوں میں جا ٹکی تھیں اور ان دیوی دیوتاؤں کے چہروں پر دنیا بھر کی محبت کا نقش دوام ہوگیا تھا ۔ ہڑی کی کھلی سے بکائن پہ آئے ہوئے توتے چہچہاتے ہوئے اڑ گئے؛ مندر کے سنہری کلسوں پر سورج نے اپنا آخری گلال کھنڈ دیا ۔ اور گھنٹیاں بجنے لگیں ۔

ایک دم — ایک دم کہیں سے منگل آ کر دروازے میں کھڑا ہو گیا ۔ وہ خوش تھا ۔ بہت خوش ۔ آج اس نے سات روپے کمائے تھے جو اس نے معمول کی طرح آتے ہی رانو کے ہاتھ میں تھما دیے اور پورن دئی بول اٹھی : "لے ، یہ پہلی کمائی ۔ وہ کمائے ، تو کھا ۔" اور رانی نے گھبرا کر پیسے ہاتھ سے چھوڑ دیے ۔ نوٹ بھنڈارے کی طرف اڑنے لگا اور سکے کچے فرش پر گر کر کونے کھدرے تلاش کرنے لگے ۔ منگل نے

حیران ہوتے ہوئے کہا : " ہنس کیوں رہی ہو چاچی ؟ "

چاچی بولی : " یہ تو اپنی اس سے پوچھ ۔" اور پھر اسے گھبرائی ہوئی رانی کے پاس ، اکیلے میں ، چھوڑ کر بڑی کو باہر گنیسیٹی ہوئی پورن دئی چل دی ۔

منگل ، پیچھے ، بے وقوفوں کی ایک مخصوص ، پرخلوص ہنسی ہنسا اور کہنے لگا : " کوٹلے کی سب عورتیں اس قابل ہیں کہ ....."

رانو نے بیچ ہی میں بات کاٹ دی : " مرد کم ہیں ؟ "

منگل کچھ نہ سمجھا ۔ دونوں اپنے اپنے جال اور اس کی گھنڈیوں میں پھنسے ہوئے تھے ۔ منگل نے اپنی ٹرنکی میں سے کرتی اٹھائی جو کبھی بھلے زمانے میں اس نے پشاور سے منگوائی تھی ، جس کے گبّے پر آون کا کشیدہ تھا اور لوکاٹ کے پھول سے بنے تھے ۔ اسے ہاتھ میں لے کر ، لہراتا ہؤا وہ باہر نکلنے لگا ، کہتے ہوئے : " کم سے کم مردوں کی بات سمجھ میں تو آتی ہے ۔"

" مردوں کی مردوں کو سمجھ میں آتی ہے ۔" رانو بولی ، " اور عورتوں کی عورتوں کو ۔" اور پھر اس نے آنکھیں مٹکائیں ، جو فن اسے لاکھوں کروڑوں صدیوں سے آتا تھا ۔ منگل نے جی ہی جی میں سوچا : ' رانی ٹھیک کہتی ہے ۔ کیا اسے معلوم تھا آج ڈھارے کے گھپ اندھیارے میں ، جہاں چودھری کے مکان کا

ملبہ پڑا ہے ، شہتیر کے پیچھے میں اور سلامتے ایک نئی ہر عمارت کی نیو رکھ رہے ہوں گے ؟ ' اس نے دروازے میں سے مڑ کر رانی سے کہا : " یہ 'تو آج کیا مرد عورت کا جھگڑا لے بیٹھی ہے ؟ "

" وہی تو جھگڑا ہے سارا ۔"

"کرکھیتر (کوروکشیتر) کی لڑائی ہے ؟ "

" اس سے بھی پرانی ۔" رانی نے جواب دیا اوز پاس آتے ہوئے بولی ، "جس میں جیتا ہؤا بھی ہارا اور ہارا ہؤا بھی ہارا ۔"

منگل رک گیا اور رانی کی بات کا کوئی گہرا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگا ۔ دونوں ایک دوسرے کے بارے میں کچھ نہ جانتے تھے ، لیکن وہ سمان تھا جب کوئی بھی بات کرو تو مطلب بن جاتا ہے ۔ اور کبھی کچھ بھی کہو مطلب نہیں بنتا ۔ اس وقت مطلب تھا یا نہیں ؟ اس کے لیے دماغ چاہیے تھا یا وقت ؟ اور دونوں کے پاس یہ دونوں چیزیں نہ تھیں ۔ رانو تینتیس چونتیس برس کی بھرپور عورت تھی جس میں نسائیت انگڑائی لے کر جاگی تھی ۔ اس میں نو عمر ، نوخیز لڑکی جیسی رعونت تو نہ ہو سکتی تھی البتہ عورت بننے کا پورا غرور تھا جو برسوں ، صدیوں سے حالات کے ردّے در ردّے کے نیچے دب کر رہ گیا تھا اور اس وقت اُبل کر ، اُچھل کر نکلتا جب اُوپر کی سطحیں کمزور ہو کر راستہ چھوڑ دیتیں ۔ بہ خلاف اس

کے منگل ، چوبیس پچیس برس کا جوان ، گھبرو شروع ھی سے دریا اور آخر دریا ، جو منبع کا محتاج تھا ، دھانے کا اور نہ کناروں کا ۔

باھر آ کر رانو نے یوں ھی برتن ٹکڑانے شروع کر دیے جو وہ چاھتی تھی وھی ھؤا : منگل سلامتے کے پاس جانے سے رہ گیا ۔ ماں جنداں نے بیٹے کو آواز دی ، اور جب وہ پاس آیا تو اسے بٹھا کر باتیں کرنے لگی ۔ رانی مصلحتاً سٹک گئی ۔ بڑی کو اور جڑواں بچوں کو کھیلنے کے لیے باھر بھیج دیا گیا ۔ رانی جا کر دروازے کے پیچھے کھڑی ھو گئی ، جو ھماری دنیا کی اکثر عورتوں کی جگہ ھے ۔

جنداں نے ابھی بات چلائی ھی تھی کہ منگل سمجھ گیا ۔ پگڑی میں سے اس کے بال جیسے اپنے آپ باھر آنے لگے اور وہ انھیں ایک ھاتھ سے اٹھا ، دوسرے ھاتھ کی انگلی سے اندر کرنے کی کوشش کرنے لگا ۔ دیے کی مٹ میلی روشنی میں اس کا چہرہ خون کے ایکا ایکی دورے سے لال ھوتا ھؤا دکھائی دینے لگا ۔

رانی نے کواڑ کے پیچھے چھپ کر ، دیوار کا سہارا لیتے ھوئے ، دل پر ھاتھ رکھ دیا ۔ منہ سے جس کی دگڑ دگڑ سنائی دے رھی تھی ۔ معلوم ھوتا تھا کوئی خونی اوپر کی منزل پر کسی کا خون کر کے اب بھاگنے کے لیے جلدی جلدی سیڑھیاں اتر رھا ھے ۔ کوئی دیکھتا وہ کیسے ایک دم توریئے کے بے بہارے پھول کی طرح

پیلی ، کمہلائی اور مرجھائی ہوئی نظر آ رہی تھی ۔ اس کے ہونٹ دیوان شاہ کی دکان پر بکنے والے پرانے چھوہاروں کی طرح سکڑ چکے تھے اور گھٹنے آپس میں ٹکرا رہے تھے ، جیسے محبت یا خوف کے ایک بارگی حملے سے لرزتے ، ٹکراتے ہیں ۔

منگل نے اُٹھ کر اندر کی طرف دیکھا ، جہاں اس کے قیاس کے مطابق رانی گئی تھی ۔ "نہیں ، یہ نہیں ہوگا ، یہ کبھی نہیں ہوگا ۔" اس نے بائیں ہاتھ کو ایک فیصلہ کن جھٹکا دیتے ہوئے کہا ، جیسے وہ چھانٹے کو دیا کرتا تھا جب گھوڑی ، بکی ، کو دُلکی میں ڈالنا ہو ۔ پھر وہ بولا : " میں ماں کی گالی نہیں کھاتا ۔ ان پنچوں کی ماں کا ... یہ تو کیا لاٹ اردن ، جارج پنجم بھی آ جائے تو میں یہ کبھی نہ کروں ۔ میری ماں کے برابر اس کی عمر ہے ۔ میں سر اس کے پاؤں پر رکھ سکتا ہوں ، پاؤں سر پر نہیں ۔"

اور وہ بکتا جھکتا ، اِدھر اُدھر تبّرے سناتا ، ہوا کو گالیاں دیتا ہوا باہر نکل گیا ۔ اُوپر منڈیر پر ایک سایہ سا لہرایا اور پھر پیچھے ہٹ گیا ۔ " ہائے نی ! نی ..." جنداں نے چلاتے ہوئے کہا ، " رانیے ! انھیے ! دیکھ کہیں اپنے آپ کو کچھ کر ہی نہ لے ۔ کہہ کے گیا ہے : ' گھر میں ایک اور تلوکے کی لاش آئے گی ۔' "

رانو لپکی ، گری ، پھر لپکی ، حتیٰ کہ دروازے کے پاس

جا پہنچی جہاں چنوں ، پورن دئی ، ودیا وغیرہ نے اسے جکڑ لیا ۔

رانی اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے بولی : " ہائے نی ، ہائے نی ..." اور اس نے اندھیرے کی طرف اشارہ کیا ۔

" کچھ نہیں کرے گا ۔" چنوں نے ڈانٹتے ہوئے کہا ۔

" ہائے ! کچھ کر لیا اس نے تو میں مر جاؤں گی ۔ ہم سب مر جائیں گے ۔ سب کا ٹھیکرا مجھی پہ ٹوٹے گا ۔

" تو مر رہ نا ۔" ودیا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا ، " ٹھیکرا توڑنے والی اور کون ہیں ، ہم ہی ہیں نا ؟ "

" ہے دیوی ماں ! میرا تو سارا بدن ٹھنڈا ہو رہا ہے ۔" رانو اپنے تشنجی ہاتھ چھاتی پر رکھتی اور پھر ، پورو کا سہارا لیتے ہوئے بولی ۔

چنوں رانی کے ہاتھ دباتے ، اسے ہوش میں لاتے ہوئے بولی : " تجھے ہی تو گرم کرنے کے لیے یہ ساری مصیبت کی ہے ۔ کیا برف ہوئی جا رہی تھی ۔"

" مجھے بچا لو چاچی ! " رانی نے پورن دئی کے پیر پکڑتے ہوئے کہا ۔

پورو نے اپنے پیر چھڑا لیے اور بولی : " مری کیوں جا رہی ہے ؟ کچھ ہونے والا نہیں ۔ ان موئے مردوں پر جب لادی ڈالی جاتی ہے ، سب ایسا ہی کرتے ہیں ۔ ہم عورتیں یہ نہ کریں تو سب کی سب دھری رہ جائیں ۔ تو تو جانتی ہے ۔"

رانو کو کچھ حوصلہ ہو گیا تھا ۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپا لیا اور بدستور لرزتی ، کانپتی ہوئی چنوں کی طرف دیکھ کر بولی : " وہ کیا کرے گا ؟ "

" جو تُو نے کیا ۔" چنوں نے کہا ۔

" کیا سوچے گا ؟ "

" جو تُو نے سوچا ۔"

بڑی پاس کھڑی سن رہی تھی اور اب تک معاملے کو کچھ کچھ سمجھ چکی تھی ۔ وہ ایک دم بولی : " ماں نے یہ سب کیا تو میں کچھ کہا مروں گی ۔"

اس پر سب عورتوں نے اپنی اپنی ناک پر اُنگلی دھرتے ہوئے ایک لمبی ، گھسٹتی ہوئی ہُو ہائے ، کی اور پھر چنوں نے بڑھ کر بڑی کی چوٹی کھینچ ڈالی اور باقیوں نے دھکے دے کر اسے اندر بھیج دیا ۔ بڑی جب اندر گئی تو شرم ، نفرت اور کدورت سے اس کا چہرہ سُوج رہا تھا ۔

(۵)

منگل ڈھارے میں پہنچا ۔ سلامتی کوٹھے کوٹھے ہوتی ہوئی منگل کے گھر جا کر جھگڑا ہوتے سن آئی تھی جو اس کی سمجھ میں نہ آیا تھا ۔ اب وہ لوٹ کر منگل کا انتظار کر رہی تھی ۔ اس کے دماغ میں ایک ' بولی ، تھی جسے وہ منگل کو سنانا چاہتی تھی :

ہسدی نے چنسد منگ لیے ، یار چھڈ گیا گلی دا آنا

(ہنسی ہنسی میں جھومر کیا مانگ لیا کہ یار نے گلی ہی میں آنا چھوڑ دیا !)

جب ہی سامنے منگل دکھائی دیا ۔ وہ غصے سے ہانپ رہا تھا ۔ ایک پل ٹھٹھکنے کے بعد وہ آ کر سلامتی سے کچھ دور کھڑا ہو گیا ۔ سلامتی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی اور منگل کی خاموشی میں ہزار مطلب تلاش کرنے لگی ، اور پھر ہزار مطلب میں ایک ہی مطلب ۔ وہ آج بن ٹھن کے آئی تھی ۔ اپنی بڑی ، بیاہی ہوئی بہن ، عنایتی کا دوپٹہ اڑا لائی تھی جس پر مقیش لگی تھی ، جو کہیں دور سے آتی ہوئی روشنی میں چمک چمک جاتا تھا ۔ شام کی ہلکی ہلکی ہوا میں سلامتی کے بدن پر لپٹا ہؤا دوپٹہ یوں کانپ رہا تھا جیسے

پیٹھے کی مٹھائی پر لگا چاندی کا ورق کانپتا ہے ۔

منگل کی آنکھیں ، اندھیرے کے باوجود ، ایک مشعل کی طرح جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں ۔ سلامتی کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا پاؤں ملبے کے پاس پڑے ایک شہتیر پہ رکھ دیا جس کا بہت سا حصہ لوگ کاٹ کر جلانے کے لیے لے جا چکے تھے ۔ آہستہ مگر مضبوط آواز میں منگل پکارا : "سلامتیے ! "

" ہوں ! " سلامتی ایک بیٹھی سی آواز میں بولی ۔

" اِدھر آ " وہ بولا اور سلامتی جواب دیے بغیر منگل کے پاس آ گئی ، رک گئی ۔

" اُتار دے دوپٹہ ۔" منگل بولا ۔

سلامتی نے دوپٹہ الگ پھینک دیا ۔

" نکال دے قمیص ۔"

سلامتی نے قمیص اُتار دی ، ایک لڑکی کے لیے سب سے مشکل بات لیکن اس لمحے کی سولی پہ لٹکی ہوئی سلامتی اپنا ارادہ ہی کھو بیٹھی تھی ۔ دایاں ہاتھ بائیں اور بایاں ہاتھ دائیں شانے پر رکھے وہ تھوڑا جھک گئی ۔

شاید وہ کچھ کہتی لیکن منگل نے اندھیرے میں ، کہیں دور سے ، اپنا آپ چھڑا کر آتی ہوئی دیے کی لَو میں سلامتی کی طرف دیکھا اور اسی وزنی آواز میں بولا : " ہو گئی سیر ۔ اب چلی جا ۔"

سلامتے نے بھونچکی ہو کر اپنے کپڑے اٹھائے ، جلدی جلدی قمیص گلے میں ڈالی اور پھر گھبراہٹ اور دہشت کے عالم میں آگے دیکھتی ، پیچھے مڑتی ہوئی ، چل دی ۔

اسی وقت کوئی پاس سے گزرا اور جیسے خاموشی کا منہ پاٹنے کے لیے ہول اٹھا ۔ "کون ہے اوئے ؟" منگل نے ایک دم تاؤ میں آ کر لتھنے پھلا لیے اور بولا ۔ "تو کون ایں اوئے مامیا ؟" اور وہ آدمی لمحے بھر کے لیے ٹھٹک کر اپنی راہ پہ ہو لیا ۔ وہ مقتول نہ تھا !

منگل کچھ دیر وہیں کھڑا ارد گرد کی فضا کو سونگھتا رہا اور پھر ایکا ایکی بائیں ہاتھ کو چھاتا لگانے کے انداز میں جھٹک کر ، سلامتے کے گھر کی طرف ساھنسیوں کی ٹھٹی میں کہیں غائب ہو گیا — ساھنسیوں کی ٹھٹی جو ہمیشہ گاؤں کے ایک طرف ہوتی ہے جہاں ارائیں ، چھینبے ، چمار ، مصلی وغیرہ رہتے ہیں اور جس کی طرف گاؤں کی گندی موریوں اور بدروؤں کا نکاس ہوتا ہے ۔

پیتھے کی مٹھائی پر لگا چاندی کا ورق کانپتا ہے ۔

منگل کی آنکھیں ، اندھیرے کے باوجود ، ایک مشعل کی طرح جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں ۔ سلامتی کے پاس پہنچ کر اس نے اپنا پاؤں ملبے کے پاس پڑے ایک شہتیر پہ رکھ دیا جس کا بہت سا حصہ لوگ کاٹ کر جلانے کے لیے لے جا چکے تھے ۔ آہستہ مگر مضبوط آواز میں منگل پکارا : " سلامتیے ! "

" ہوں ! " سلامتی ایک بیٹھی سی آواز میں بولی ۔

" اِدھر آ " وہ بولا اور سلامتی جواب دیے بغیر منگل کے پاس آ گئی ، رک گئی ۔

" اُتار دے دوپٹہ ۔" منگل بولا ۔

سلامتے نے دوپٹہ الگ پھینک دیا ۔

" نکال دے قمیص ۔"

سلامتی نے قمیص اُتار دی ، ایک لڑکی کے لیے سب سے مشکل بات لیکن اس لمحے کی سولی پہ لٹکی ہوئی سلامتی اپنا ارادہ ہی کھو بیٹھی تھی ۔ دایاں ہاتھ بائیں اور بایاں ہاتھ دائیں شانے پر رکھے وہ تھوڑا جھک گئی ۔

شاید وہ کچھ کہتی لیکن منگل نے اندھیرے میں ، کہیں دور سے ، اپنا آپ چھڑا کر آتی ہوئی دیے کی لَو میں سلامتی کی طرف دیکھا اور اسی وزنی آواز میں بولا : " ہو گئی سیر ۔ اب چلی جا ۔"

(٦)

پنچوں کی مقرر کی ہوئی تاریخ آ پہنچی ۔ پورو ، چنون اور ودیا نے مل کر رانو کے ہاتھوں پر مہندی لگا دی اور کنگھی کر کے اس کی مینڈھیاں گوندھ ڈالیں اور سر پر خوب صورت سا ڈاک بنگلہ بنا دیا ۔ اتنا دلاسا دیے جانے کے باوجود رانو کانپ رہی تھی ، رو رہی تھی ۔

بچے نا سمجھی کے عالم میں چپ تھے اور سوچ رہے تھے، آج ان کی ماں کے ساتھ کیا ہو رہا ہے ؟ بڑی ان کے گلے میں اپنی لانبی لانبی باہیں ڈالتی ہوئی ، چپ کرانے کے بہانے انھیں رُلا رہی تھی اور پھر ، جیسا کہ بندوبست کیا گیا تھا ، سب بچوں کو چنون موسی کے گھر بھیج دیا گیا ۔

آنگن میں پینسی کی میلی سی چادر تنی تھی جس کے نیچے کچھ گھڑے رکھے تھے ۔ ایک طرف پرانی سی کائی ماری ٹھلیا پڑی تھی اور ان سب پر سیندور مچل رہا تھا ۔ رانو کو لا کر جب چادر کے نیچے بٹھایا گیا تو اس نے ایک دل دوز چیخ ماری : " مرنے والے ! آ دیکھ ، کیا ہو رہا ہے تیری رانی کے ساتھ ۔"

پروھت نے کہا : " لڑکا کہاں ہے ؟ "

پنڈت گیان چند ، کیسر سنگھ اور دوسرے لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا ۔ وہ تو اسے زبردستی پکڑ کر لائے تھے اور چارپائی کے ساتھ باندھ دیا تھا ۔ مہر کرم دین ، جو اس رسم و رواج سے ذرا پرے ہٹ کر بیٹھا تھا ، ڈھونڈھتا ہؤا اندر گیا اور انہی پیروں لوٹتے ہوئے بولا : " منکلو تو اندر نہیں ہے ! "

اس دن آتر سے آنے والی ہوا ، طنابوں کی مدد سے ایک طرف بکائن اور دوسری طرف روشندان کی سلاخوں سے بندھی ہوئی چادر کو پھڑ پھڑا رہی تھی ، مفت کی دف بجا رہی تھی ۔ چادر کے نیچے رسیوں کے ساتھ ساتھ بندھی ہوئی کاٹھ کی چڑیاں لہراتی ہوئی چوں چوں کرنے لگیں ۔ کچھ دور تنور کے پاس اس کی بھبھل میں لیٹے ہوئے ڈبو نے اپنی ٹانگوں میں دبائی ہوئی گردن اٹھائی اور مشکوک انداز میں اس پورے منظر کو دیکھنے لگا ۔ وہ اب تک بوڑھا اور نحیف ہو چکا تھا ؛ نہ زیادہ روشنی برداشت کر سکتا تھا اور نہ شور ۔ وہ گاؤں کے مرد عورتوں کی بے طور حرکتیں دیکھ کر الٹھ کھڑا ہؤا اور اندازے ہی کے ساتھ دشمن پہ بھوں بھوں کرنے لگا ۔

" میں تو جانتا ہوں ، وہ نطفہ ـــ" حضور سنگھ نے کہنا شروع کیا ۔

" دُر ، دُر ! " جنداں حضور سنگھ کو پھٹکارتے ہوئے بولی ۔ " سوائے بکتے رہنے کے اور کوئی کام ہی نہیں ۔" اور وہ

ایک چادر میلی سی

اپنی مردہ ، بے نور سی آنکھوں سے اس جمگھٹے کی طرف دیکھنے اور سنسنانے لگی ۔ وہ نہ جانتی تھی اب آسمان سے اگلی کون سی بلا نازل ہونے والی ہے ؟ چونکہ اس کی آنکھیں دھندلی تھیں اس لیے اپنے مقتول بیٹے کی شکل اور بھی کھل کر اس کے سامنے آ رہی تھی ۔

" ٹھہر اوئے باھمنا ! " نمبردار تارا سنگھ نے پروھت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا : " میں لاتا ہوں اس ماں کے یار کو پکڑ کے ۔"

" ھاں ! " کیسر سنگھ نے حامی بھری : " اس کی میں بہن کے بیاہ میں جوتے کھاتا پھروں ۔"

" ہم سب چلتے ہیں ۔" جگو بھی تیار ہو گیا ۔

دیوانا بولا : " اتنے جوتے پڑے اس پہ بھی بھاگ گیا ! "

گویا اس سے پہلے ، اسے " ٹھیک کرنے " " سیدھے راستے لانے " کے سلسلے میں ، گاؤں کے لوگ اس سے " ٹیڑھے " ہو چکے تھے ۔ وہ تو چاہتے تھے اس کی ایک آدھ ٹانگ ہی توڑ دی جائے تا کہ چادر کے نیچے آ کر بیٹھے تو پھر ہل ہی نہ سکے ۔ چھ سات آدمی ہاتھ میں لٹھیں اور گنڈاسے لیے ہوئے باہر لپکے اور گیان چند سرپنچ ، قانون کا سرسری محافظ ، صرف دکھاوے کے لیے منع کرتا ، شور مچاتا ہوا سب سے پیچھے ..... وہاں صرف عورتیں ہی رہ گئیں جن میں سرسا دائی بھی تھی جو

ایک چادر میلی سی

منگل کو اس دنیا میں لائی تھی ۔

مردوں کو یوں نکلتے دیکھ کر رانو واویلا کرنے لگی :
" چھوڑ دو ۔ ہائے نی ! مجھے چھوڑ دو ، میں نہیں بچوں گی ۔"
اور یہ سب ٹھیک ہی معلوم ہو رہا تھا ۔ رانو پیچھے کی طرف گری اور بے ہوش ہو گئی ۔ عورتیں اسی شادی کے لیے رکھے ہوئے گھڑوں میں سے پانی آنڈیل آنڈیل کر رانو کے منہ پر چھینٹے دینے ، اسے ہوش میں لانے لگیں ۔ گویا وہ کبھی رہی نہیں ، اس نے موت دیکھی ہے تو اب شادی بھی دیکھے ۔

منگل کو لوگوں نے فارم کی ساتویں کپاس میں جا پکڑا ۔ وہ پہلے ہی بہت سی مار کھا چکنے کے بعد نڈھال ہو چکا تھا ، اب دہشت سے اور بھی نیم جان ہو گیا ۔ وہ چاہتا تو اِکا لے کر ہمیشہ کی طرح ستراہ یا ستّوکی کی طرف نکل جاتا لیکن شومئی قسمت ، اس مرزے کی بکی کو بھی استہزا کی صاحباں نے " ڈھنگ" دیا تھا ۔ بکی اپنی بندھی ہوئی اگاڑی کے ساتھ کچھ فاصلے پر کھڑی ہری ہری چری اور موٹھ کھا رہی تھی اور موقع پڑنے پر ساتھ والے کھیت میں لہلہاتی ہوئی گوار کو بھی منہ مار لیتی ۔ گاؤں والوں نے ممکنات کا خیال رکھتے ہوئے بکی کے پاؤں میں لوہے کا یہ بڑا ، موٹا سا سنگل ڈال دیا تھا اور اس پر علی گڑھ کا تالا ، اور اب وہ بے فکر ہو چکے تھے ۔ منگل کا خیال تھا اس کے یار غار : نواب ، اسماعیل اور گورداس وغیرہ اسے اس سانحے

سے بچائیں گے لیکن اسے کیا معلوم کہ وہ بے غیرت بھی کوٹلے کے باقی لوگوں کے ساتھ مل جائیں گے اور بار بار یہی کہیں گے: "آخر عورت ہی کی بات ہے نا، یار! کوئی موت کی تو نہیں۔"

منگل جہاں چھپا تھا وہاں سے دو ہاتھ دور خالقاہ والا کنواں تھا جہاں آج سے چند ہی برس پہلے منگل کے بڑے بھائی تلوکے کا قتل ہوا تھا۔ جب شام کے وقت، سمے سے پہلے ہی، گھپ اندھیرا ہو گیا تھا اور ایک دن پہلے سورج نے زمیں کی بکائن پر خون کے چھینٹے پھینک دیے تھے۔ اس مٹی سے اب بھی خون کی بُو آ رہی تھی۔

منگل کپاس کے بغل میں ایک تنگ و تاریک "کڑھ" میں بیٹھا شک اور وسوسے میں بٹا، پھٹی پھٹی آنکھوں سے باہر دیکھ رہا تھا جب کہ گاؤں کے لوگ پہنچ گئے۔ سردیوں کے موسم میں کبھی کبھی، کوئلہ گاؤں میں کوئی بھیڑیا یا جنگلی سؤر آ نکلتا تھا اور لوگ اسی طرح لاٹھیاں اور چھویاں، ٹوکے اور گنڈاسے لے کر اسے گھیرنے، مارنے کے لیے نکل جاتے تھے۔ اور آخر اسی وقت دم لیتے جب گھرے ہوئے جانور کے پرخچے اڑ جاتے۔

لوگ آ کر سامنے کھڑے ہو گئے۔ منگل کوٹھڑی میں دو ہاتھوں کے بل جھکا، دہشت کے عالم میں سب کو دیکھتا ہوا، سچ مچ ایک جنگلی سؤر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ نہتا تھا

اور باقی سب کے سب مسلح ۔ کہاں تو لوگوں نے شور سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا اور کہاں وہ اب آ کر سامنے کھڑے ایکا ایکی چپ ہوگئے تھے ؛ ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھ رہے تھے ، گھور رہے تھے؛ دیکھیں پہلا وار کون کرتا ہے ؟ شکار کس طرف لپکتا ہے ؟

منگل کا نرخرہ کانپنے لگا اور لوگوں کے دل دھک دھک کرنے لگے ۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد منگل نے ذرا سی جنبش کی ۔ لوگوں نے ایک دم خائف ہوکر خالی زمین ہی پہ لاٹھیاں برسانی اور ٹوکے چلانے شروع کر دیے ۔ ایک شدید ڈر نے ان میں ایسا جوش ، ایسی طاقت بھر دی کہ زمین میں بڑے بڑے شگاف ہو گئے ۔

ایک بار پھر وہ ایکا ایکی چپ ، ایک دوسرے کو دیکھنے لگے ۔ شکار اور شکاری ! منگل کے اپنے دوست ، اپنے ساتھی ، اِکے والے گوروداس نے جی کڑا کیا اور آگے بڑھتے ہوئے بولا :

" دیکھتا ہوں یار کون سا جنّا ہے ؟ "

گوروداس کے بڑھنے کی دیر تھی کہ کیسر سنگھ ، جگو ، نواب ، اسماعیل سب جھپٹ پڑے ۔ ان کے جھپٹنے کی دیر تھی کہ منگل نرغے میں سے نکلنے کے لیے لپکا ۔ پھر متداول ، ہراول اور قلب ، سب طرف سے لوگوں نے اسے آ لیا ۔ جس کے ہاتھ میں لاٹھی تھی ، لاٹھی ، جس کے ہاتھ میں جوتا تھا

جوتا ، منگل پر برسانے لگا ۔ اگر وہ کچھ کرتا تو گنڈاسے اور ٹوکے بھی تھے ۔

شور شرابا سن کر راہگیر جمع ہو گئے ۔ منگل کو بالوں سے پکڑ کر بیچ کھیتوں اور کھلیانوں کے گھسیٹا جا رہا تھا ۔ سکھ ہونے کے ناطے نمبردار تارا سنگھ یا کیسر سنگھ کا فرض تھا کہ بالوں کو بے حرمتی سے بچاتے لیکن یہ کسب کرنے میں وہی پیش پیش تھے اور اس میں ایک مزا اور انتقام لے رہے تھے ۔ گھسیٹے جانے کی اذیت سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے منگل کچھ دور تک اپنی مرضی سے ساتھ چل لیتا ، لیکن پھر پیچھے کی طرف کھینچنے لگتا جیسے کسی اڑیل ٹٹو کو پانی پلانے لے جا رہے ہوں ۔ اس کے بدن ، پھٹے ہوئے کپڑوں ، لمبے لمبے کیسوں اور داڑھی میں دھرکوٹنے کی جھاڑیاں ، کپاس کی من چھٹیاں ، مکئی کے ٹانڈے ، خشک آک میں سے اڑنے والی بڈھی مائیاں اور نہ جانے کیا کیا کچھ گھسٹتا آ رہا تھا ۔

جوہڑ اور دھرم شالہ کے بیچ تک پہنچتے پہنچتے یہ جلوس خاصا بڑا ہو گیا ۔ مسافر سڑک کے ایک طرف رک کر حیرانی سے دیکھنے لگے ۔ کیکر کی باڑ کے پیچھے سے آچک کر ایک راہگیر عورت نے گاؤں کی ایک مٹیار سے پوچھا :

" ہائے ہائے نی سُکھو ، یہ کیا ہو رہا ہے ؟ "

سکھو نے عورت کی طرف اس نظر سے دیکھا جیسے کہہ رہی

ہو : " ہو ھائے ، بے بے ! اتنی سیانی ہو کے تو یہ بھی نہیں جانتی ؟ " اور بولی : " شادی ! " اور پھر وہ لوٹ کر یوں دیکھنے لگی جیسے کوئی بات ھی نہیں ۔

کوٹلے سے دور ، ویشنو دیوی کے پہاڑ کا خا کہ اب بھی دھندلا سا نظر آ رہا تھا ۔ اس وقت ضرور وھاں بے شمار جاتری پہاڑ کی پرکرما کرتے ہوئے جا رہے ہوں گے کیونکہ اسی پورنیما کو ویشنو دیوی میں جاتریوں کا اکٹھ تھا ۔ وہ ضرور ڈھولکیاں ، چھینے بجاتے ہوئے گا رہے ہوں گے ۔ بہانا ہے تو بہا لو ، امباجی! پاپیوں کے بہانے کی یہی بیلا ہے ۔ گاتے بجاتے ہوئے انھوں نے ضرور دکھن کی طرف دیکھا ہوگا اور ضرور ان کی نظریں کوٹلہ گاؤں کے دھندلکے ، اندھیارے سے ٹکرا کر لوٹ گئی ہوں گی ۔

گاؤں کے باھر یہی ایک نشیب تھا جو سر پنچ گیان چند اور اس کے مزدوروں سے پاٹنا رہ گیا تھا جس میں منگل ، مار کھاتا ہؤا منگل ، بے سدھ ہو کر گر گیا ۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں بڑی بڑی کسیوں اور کدالوں سے کھدائی کر کے جوھڑ کے پانی کو اندر لایا جاتا تھا اور پھر مٹی کی گول گول ٹنڈوں کی مدد سے اوپر جہلم ارین کی کیاریوں کی آبیاری کی جاتی تھی جس کی وجہ اس کی کھیتیاں سدا بہار رھتی تھیں ۔ پھر ان پر پھروانہہ کی سنسناتی ہوئی چھاؤں ، جس میں بے شمار مسافر سستا چکے تھے ۔ اس وقت کچھ دنوں کے لیے بند باندھ کر پانی کو روک

دبا گیا تھا لیکن منگل کے چاروں شانے چت اس میں گرنے سے بند ٹوٹ گیا اور جوہڑ کے پانی کے لیے راستہ بن گیا اور پانی تیزی کے ساتھ اندر آنے لگا ۔ اس سے پہلے کہ لوگ منگل کو اٹھاتے اس کے کپڑے پانی سے گیلے اور منہ کیچ میں لت پت ہو چکا تھا ۔ منگل نے کئی بار اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کی لیکن آٹھ دس مضبوط بازوؤں کی جوڑیاں اپنے گرد پا کر وہ شرابی کی طرح بنکارتا ہؤا راستے پر ہو لیا ۔

عجیب سا دولھا تھا : بال بکھرے ہوئے اور سر پر سے پگڑی ندارد ، ہاتھ میں کند سی کرپان ، سہروں کی جگہ جھاڑیاں اور کانٹے ، کیسر کے چھینٹوں کی جگہ کیچ کے لوندے ، آنکھوں میں محبت کے نشے کی بجائے نفرت ، ندامت اور ہزیمت کے آنسو اور گدلا پن ؛ اور عجیب سی برات ، جیسے شیو جی پاروتی کو لینے آئے ہوں : گلے میں رود راکش کی مالائیں ، اور سانپ ، منہ میں دھتورہ اور بھانگ ، کمر میں لنگوٹ اور کاندھے پر مرگ چھالا اور ہاتھوں میں ترشول ؛ براتی بندر اور لنگور ، شیر اور چیتے اور ہاتھی — اس پہ شہنائی کے بجائے ایک عجیب طرح کی کاہش اور خواہش ، وحشت اور شہوت پیدا کرنے والی کستا مکھی کی بھنبھناہٹ اور آٹے کی مشین کی کو ... کو ... کو .. کو !

جب منگل کو رانو کے ساتھ بٹھایا گیا تو وہ لہو لہان تھا اور رانو مکمل طور پر بے ہوش ۔ لیکن سب عورتوں کو یقین

تھا ، آخر میں سب ٹھیک ہو جائے گا ۔ اگرچہ چادر کی رسم معمولی ہوتی ہے اور اس میں بہت کچھ نہیں کیا جاتا لیکن یہاں چنوں اور پورن دئی اور ودیا اور ککی اور چنڈی نے مل کر ایک پوری شادی کا سامان کر دیا تھا ، ورنہ وہ سب ضائع ہو جاتا ۔ لڑکا عام طور پر لڑکی کے یہاں جا کر اسے بیاہ کر لاتا ہے لیکن اس وقت لڑکی کا مائیکہ بھی یہیں تھا اور سسرال بھی یہیں ، آگا بھی یہیں پیچھا بھی یہیں ۔ پورن دئی باہمنی ، ودیا اور کچھ دوسری عورتیں ، لڑکی کے ماں باپ ، مائیکے کی طرف سے ہو گئیں ۔ جنداں ، چنوں ، سروبو ، چنڈی اور سرما سسرال کی طرف سے ۔ سب ایک دوسرے کی سمدھنیں بنی ، آمنے سامنے صف آرا ہو گئیں جیسے کوئی لڑائی لڑنے جا رہی ہوں ۔ ماں کی حیثیت سے جنداں نے اپنے تقریباً پوپلے سے منہ کو جنبش دی اور " گھوڑی " گانا شروع کی :

" ارے بنے !

چھوٹی چھوٹی بوندنیاں مینہ برس رہا ہے

سہاگن ماں تیرے شگن منا رہی ہے !"

اور پھر اس نے ہاتھ اونچا کر کے چنوں ، سروبو اور سرما وغیرہ کی طرف اشارہ کیا جو ایک ہی ساتھ شروع ہو گئیں :

"بہن سہاگن تیری گھوڑی کی باگ پکڑے ہوئے ہے ، بنے!

بھابی سہاگن سرمہ ڈال رہی ہے

اور باپ تیرا ، زر کی تھیلی کا منہ کھولے کھڑا ہے ! "

اسی وقت بڑی ، بھائیوں کی قطار لیے چھت پہ چلی آئی - چھوٹا چموں پیچھے آنے اور باجا سننے پر مچل رہا تھا - بڑی اسے منع کرتی ، مارتی رہی - لیکن اس کا اپنا جی وہ سب کچھ دیکھنے سننے کو چاہ رہا تھا - چنوں موسی کے ہاں سے نکلنے، کوٹھے پر آنے کی دیر تھی کہ سب ہی پیچھے آ گئے اور منڈیر پر کھڑے ہو کر اپنی ماں کی شادی دیکھنے لگے - بڑی پہلے آٹھ آٹھ آنسو روئی اور پھر وہاں کا رنگ دیکھ کر ایک بچی کی طرح سب کچھ بھول کر ، نیچے کی طرف سرکنے لگی - ودیا نے چلا کر کہا : " انیو ! — گاتی کیوں نہیں ہو ؟ " اس پہ سب نے اپنی اپنی آواز بلند کر دی - تارا سنگھ ، گیان چند ، دیوانا ، کیسر سنگھ ، جگو ، رلدو ، دلا ، جالا اور گاؤں کے مصلی ، جو کچھ دور کھڑے چور آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ، ایک دم بول اٹھے : " گاؤ ! گاؤ نا -" اتنے میں رانو کو ہوش آ گیا اور وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ، کیا مرد اور کیا عورت ، سب کو دیکھنے لگی ، جیسا کہ دلہن کبھی نہیں کرتی - ودیا نے گیت اٹھایا اور پھر باقی بھی سب کی سب شامل ہو گئیں :

" پیلی پیلی دال تیری گھوڑی چرے -
اور میرا بنا — لپک کر گھوڑی پر سوار ہو

اور چھوٹی سی بنوں کو لے کے محلوں میں آئے۔"
اور پھر منظر لڑکی والوں کے ہاں پہنچ گیا ۔ پورن دئی نے سہاگ شروع کیے ، رانی کے باپ کو خطاب کرتے ہوئے :

بابل ! تجھے نیند پیاری ہے ؟
ارے! گھر میں کنیا کواری ہے!
سندر بیٹی تیری بر مانگتی ہے ، در مانگتی ہے ، اچھا سا گھر مانگتی ہے ! "

اوپر کسی نے منہ پر مٹھی گول کر کے باجے کی سی آواز نکال دی ۔ بس پھر کیا تھا ۔ سب سمجھ گئے برات آ گئی ۔ خوب خوب دھما چوکڑی مچی ۔ گاؤں کے سب بوڑھے بچے ، مرد عورتیں سامنے کے کھلے میدان میں ، کنویں کے منہ پر ، کوٹھوں کی چھت پر ، درختوں کے اوپر ، یہاں وہاں ، سب جگہ پہنچ کر بیٹھ گئے ۔ پورن دئی اور اس کی طرار ساتھن ودیا نے برات کی طرف اشارہ کر کے آئے ہوئے مہمانوں کو بندر سؤر ، بھڑوے اور جانے کیا کچھ کہا اور ایسا کرنے میں ہاتھ اپنے اپنے مردوں کی طرف اٹھا دئے جس پر خوب ہی کھلی پڑی ۔ سمدھنیاں ناچیں ، ڈومنیاں تھرکیں ۔ جب ہی پورن دئی نے اپنی بانہہ آلاری اور وہ نظارہ گاؤں کے لوگ آج تک نہیں بھولے کیوں کہ چولی کے نیچے سے پورو کی ولایتی انگیا نے آنکھیں ماری تھیں ، پھر اس نے ودیا کے ساتھ مل کر کئی

نمکین اور مرچیلی سٹھنیاں دی تھیں :

" پودینے کی کرو کڑاھی رے -

منگل کی ماں ، رنڈی کی بیٹی آئی رے -

ھمارا اچھا کرارا پودینہ ! "

اس پر نواب کی بیوی عائشہ ، جہلم اربن اور اس کی تینوں بیٹیاں ، عائشہ ، عنایتی اور سلامتی بھی شامل ھو گئیں جیسے پودینہ صرف انہی کی ملک تھی اور سب ناچ ناچ اٹھیں :

ھمارا اچھا کرارا پودینہ !

مصالحوں والا پودینہ !

منگل کی بہن تھانے داروں سے چھڑائی رے -

پودینے کی کرو کڑاھی رے -"

پھر ھنسی ، کھیل ، کلکاریاں ، جن میں مرد بھی شامل ھو گئے ، بچے بھی اور بوڑھے بھی - کون کس کی چوٹی کھینچ رھا تھا اور کون کس کو کلاوے میں لے رھا تھا ، یہ کسی کو پتا نہ چلا - پورن دئی جالے کی بانہوں میں پڑی تھی اور وھیں مچل مچل گئی - ودیا سروپو کو لپٹ لپٹ رھی تھی - بڑی نیچے آ کر جو کھڑی ھوئی تو اسے کسی طرف سے دھکا پڑا اور آنکھ گیان چند کی جانگھوں میں جا کھلی جو اسے بڑے پیار بڑی ھی شفقت سے بھینچ رھا تھا -

جب ھی چادر کھینچی اور شادی ھو گئی ..... ایکا ایکی

سب خاموش کھڑے ہو گئے کیوں کہ دولی رخصت ہونے کا سمے آ گیا تھا ۔ مائیکے والوں نے گانا شروع کر دیا :

" بابل! اب تیرا کیا دعویٰ ہے ؟

دولہا کا باپ ڈولی کی منیاں پکڑے کھڑا ہے ، اب دعویٰ اس کا ! بھیا ! تیرا اب کیا دعویٰ ہے ؟

دولہا کا بھائی ڈولی کے بازو تھامے کھڑا ہے ، اب دعویٰ اس کا ! "

اور پھر ایک واحد بین لڑکی کا :

" بابل طاقچوں میں میری گڑیاں بکھری ہیں لیکن مجھے کھیلنے کا چاؤ نہیں ۔

بابل ! انگ سہیلیاں یہاں وہاں سے مجھے ملنے آئی ہیں لیکن مجھے ان سے بھی ملنے کا چاؤ نہیں !

ہائے روتی ماں کی انگیا بھیج گئی اور باپ تو دریا رو رہا ہے ۔" پھر منہ دکھائی اور جگ ہنسائی ، آخر سر جوڑی !

پہلے رالو کو اور پھر منگل کو پکڑ کوٹھڑی میں دھکیلتے ہوئے باہر سے تالا لگا دیا گیا جسے چوں ، دونوں جڑواں بھائی اور بڑی دیکھ رہے تھے اور اپنی آنکھیں جھپک رہے تھے ۔

(۷)

اس رات رانو ایک بہن ، بیوی اور ماں کی طرح منگل کے زخموں پر سینک کرتی رہی ۔ باہر تو جا نہ سکتی تھی ، اس لیے وہیں دوپٹے کو منہ میں ٹھونس کر وہ اس میں اپنے گرم گرم سانس کی دھولکنی چلاتی اور منگل کی سوجن پہ رکھ دیتی ۔ اسے آرام بھی آ رہا تھا اور بیچ بیچ میں وہ کراہ بھی رہا تھا ۔ کبھی کبھی درد بغیر پتا دیے ، بنا خبردار کیے ، شعور کی تہوں میں کہیں گم ہو جاتا تو منگل کو رانو کے ہاتھ عجیب سے لگنے لگتے شاید ان ہاتھوں میں رچی ہوئی مہندی کا رنگ اس اندھیرے سے بھی تیکھا تھا اور لہو اس کھٹے سے بھی تیز جو سردی اور گرمی کے ملاپ میں ایک دم مہک اٹھتا ہے اور پھر دل میں ایک عجیب طرح کی آن کہی ، آنکھ میں عجیب طرح کے آن بہے چھوڑ کر ، چند ہی دلوں میں بت جھڑ کا شکار ہو جاتا ہے ۔

رانو یکسر بھول چکی تھی اس کے بچے کہاں ہیں ؟ کیسے سوئے ہیں ؟ ان میں سے کسی نے کچھ پیٹ میں ڈالا بھی ہے یا نہیں ؟ ایک بار چھوں کی شبیہ لپک کر اس کی سوچ میں آئی اور پھر ویسے ہی ، اپنے آپ چلی گئی ۔ یہاں جو کچھ ہو رہا

تھا وہ چوں سے کہیں بالا تھا ۔ چوں اور اس کے ساتھ کے لاکھوں کروڑوں بالک اس کا ایک حصہ تھے ، اور بس ۔ کبھی بیچ میں منگل بدک کر پہلو موڑ لیتا تھا ۔ پھر رانو ایک طرف جا کر بیٹھ جاتی اور دبی دبی سسکیاں لینے لگتی جو تخلیق سے پہلے ہر عورت کا مقدر ہوتی ہیں ۔ ایکا ایکی اُسے پیاس لگی ۔ لیکن کھڑکی کھول کر کسی کو پانی کے لیے کہنے کی ہمت نہ ہوئی ۔ پھر منگل بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔ ایکا ایکی اس پر کوئی پاگل پن کا چکر آیا اور دونوں ہاتھوں سے اُس نے اپنا رہا سہا کرتا بھی پھاڑ ڈالا ۔ " میں مر گئی" رانو چلائی اور اس کے پاس چلی آئی ۔

" پرے ہٹ جا " منگل نے دھکا دیتے ہوئے کہا ۔

پچھلی رات رانو نے منگل کے پاؤں پکڑ لیے اور اُن پر سر رکھتی ، روتی ہوئی بولی :

" تُو تو جانتا ہے ، منگلا ، اس میں میرا کوئی قصور نہیں ۔"

منگل جو اب تک مضمحل ہو چکا تھا بولا : " جانتا ہوں ۔" اور پھر نہ جانے کس جذبے سے اس نے رانو کا ہاتھ پکڑ لیا ۔ اندھیرے میں مسلسل دیکھتے رہنے سے اسے پتا پتا ، سوئی سوئی دکھائی دینے لگی تھی ۔

رانو نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہنے دیا اور دھڑکتے ہوئے دل سے انتظار کرنے ، دیکھنے لگی کہ اس کی تقدیر کا

ساتھی ، اگلے لمحے ، اس مہندی رچے ہاتھ کو اپنے کرخت چھاتے والے ہاتھوں میں رہنے دیتا ہے ، یا جھٹک دیتا ہے ؟ لیکن ایسا تو کچھ بھی نہ ہؤا ۔ منگل کا ہاتھ جیسے اپنے آپ نیچے گر گیا اور ساتھ رانو کا بھی ۔ باہر لوگ ہمیشہ کی طرح یہی سمجھتے رہے ، شادی ایک مسلسل شب زفاف کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ کچھ لوگ تو سرے ہی سے نہ جانتے تھے اور جو جانتے تھے ان لمحوں کو بھول چکے تھے جو اُن پر بھی آئے تھے ۔ جو تہیدگی اور ہیجان اور اہتزاز دو دلوں کے بیچ پیدا ہؤا تھا ، شب زفاف کی لذت اس کے مقابلے پہ ایسی ہی تھی جیسے کوئی مفروضہ حاتم سے مہریں مانگنے جائے ، اپنے ساتھ پوری انسانیت اور اس کے وقار کو اس کے قدموں پہ جا گرائے اور اس کے عوض میں ایک دمڑی پائے ، اس پر بھی دعائیں دیتا ہؤا گھر چلا آئے ۔

صبح جب رانو اور منگل جاگے تو کسی نے تالا کھول دیا تھا ۔ منگل اٹھا ۔ اُس نے چلنے کی کوشش کی لیکن دو ہی قدم کے بعد کراہتا ہؤا لوٹ آیا اور روتے ہوئے اپنے عروسی بستر پہ گر گیا ۔ رانو بھاگ کر باہر پہنچی اور جا کر ماں جنداں کے پاس کھڑی ہو گئی ۔

"کیا ہے بہو ؟" جنداں بولی ۔

اس پر رانو نے کہا : "بھنڈارے کی چابی دو ، ماں ۔"

" وہ کس لیے ؟ "

" ہلدی نکالنا ہے ، اسے بہت مار لگی ہے ۔"

چنداں نے اپنے دوپٹے کے پلو سے چابیاں کھول کر رالو کو دے دیں ۔ بھنڈارے کی طرف جانے کے بجائے رالو برآمدے کی طرف لپکی جہاں بچے آدھے ننگے ، آدھے ڈھکے ہوئے سو رہے تھے ۔ رالی نے باری باری سب کا منہ چوما اور ان کے بازوؤں ، ٹانگوں میں اڑی ہوئی چادریں کھینچ کھینچ کر ان کے جسموں کو ڈھانپا ۔ گلابی سی سردی سے ہاتھ رانوں میں دیے ، سکڑے ہوئے بچے ایک تسکین کے احساس سے سیدھے ہونا شروع ہوئے لیکن جب رالو بڑی کے پاس پہنچی تو وہ جاگ رہی تھی ۔ اس سے پہلے کہ رالو اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتی ، بڑی نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں سے ماں کا منہ نوچ لیا اور بولی : " جا تو ، اسی سے منہ کالا کروا ۔"

رالو پر پہلے کیا کم گزری تھی کہ اس پر بیٹی نے منہ نوچ لیا ! وہ تو بڑی کو یہ بھی نہ کہہ سکتی تھی : " بیٹی ! تیرے ہی لیے تو میں نے یہ سب کیا ہے ۔ اور تو اور ، تو بھی ؟ " لیکن اس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی ؟ وہ تو یہ بھی نہ سوچ سکتی تھی — اس کی بیٹی ، اس کی اپنی ، جسے اس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا ، ہزار اذیتیں سہہ کر آخر ایک دن جانکاہی کے عالم میں اس دنیا میں لائی بے بسی اور

میلے سے دھوتی روتی ہوئی بالا ، بڑا کیا ، اور اب بڑی ہو کر اس نے منہ نہیں نوچا ، پھول برسائے ہیں ! رانی ایک کند اور خالی ذھن کے ساتھ اندر ھلدی لینے کے لیے چلی گئی ، جسے نکال کر اس میں تیل ڈال کر توے پہ پکایا اور پھر منگل کی چوٹوں پر باندھنے کے لیے لے چلی ۔ اندر پہنچی تو منگل وھاں نہ تھا ۔ شاید ، جب رانو اپنی ساس کے پاس تھی ، وہ کہیں نکل گیا تھا ۔ رانو دوڑ کر باھر دروازے تک گئی ، منگل کا کہیں سایہ تک نظر نہ آیا ۔ البتہ ڈھو پاس آ کر دم ھلانے ، چوں چوں کرنے لگا اور اگلے پنجے اٹھا اٹھا کر رانو پہ رکھنے لگا ، جیسے کہہ رہا ھو " میں جانتا ھوں رانی ! تیرے ساتھ کیا ھؤا ؟ سب ٹھیک ھو جائے گا ، آخر سب ٹھیک ھو جائے گا ۔"

چنوں روز سویرے مندر جایا کرتا تھی اور صبح کی دودھیا ٹنکی پہ اس کی آواز پیرتی ھوئی آیا کرتی : " منا تیں رام نہ بالیا رے ! " لیکن آج مندر جانے کی بجائے وہ سیدھی رانو کے پاس چلی آئی ۔ رانی بھی اسے دروازے میں کھڑی مل گئی ، پوچھتے ھی چنوں نے پوچھا :

" کیوں رانی ؟ سب سکھ ہے نا ؟ "

رانی چپ رھی ۔

" بول نا ۔" چنوں پوچھنے لگی ۔ اس پر بھی جب رانی کچھ نہ بولی تو چنوں نے اسے جھنجھوڑتے ھوئے کہا ۔ " بول ، رات

کچھ ہوا ؟ ہائے کیسی گھنگھنیاں منہ میں ڈالی ہیں ؟ "

جو گھنگھنیاں رانو نے منہ میں ڈالی تھیں ، ان کے بارے میں کیسے بتاتی ؟ اس کھولتے پانی کی تپش اور جلن ، جن میں اس کے جذبات ، ان کی کاشت اور حاصل برداشت کا دانہ دانہ تک اُبل گیا تھا ، جل گیا تھا ، چنوں کو کن الفاظ میں بیان کرتی ؟ لہجے دیکھتی پھڑکتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ رانی بولی :

" رات کچھ نہیں ہوا ۔"

چنوں نے غور سے رانو کے چہرے کی طرف دیکھا اور بولی :

" جھوٹ بکتی ہے ؟ ہلا (اچھا) تیرے منہ پر یہ ناخنوں کے نشان کیسے ہیں ؟ "

ٹھنڈے پسینے کے قطرے رانو کے چہرے پہ چلے آئے اور وہ کچھ نہ بولی ۔ کچھ دیر یوں ہی بیکار ، شرمسار سی کھڑی رہنے کے بعد جیسے وہ ایکا ایکی اُبل پڑی ۔ " تو جو کہتی ہے ، چنوں ! مجھے اس کی ضرورت نہیں ۔ میں تو تن ڈھانپنے کے لیے دو کپڑے مانگتی تھی ، بھینا ! پیٹ میں ڈالنے کے لیے دو روٹیاں ۔ پتا نہیں واھگورو پرماتما کو کیا منظور ہے ؟ دیوی ماں کیا چاہتی ہے ؟ وہ اب پھر چلا گیا ہے کہیں ۔"

" ہائے رام ! " چنوں نے پیچھے گلی کے اندھیرے کو صاف ہوتے ہوئے دیکھا اور کہنے لگی ۔ " کدھر گیا موا ، تت پلتا ؟ " اور پھر ایک دم کسی غلطی کا احساس کرتے ہوئے بولی ۔ " میں منہ جلی ، تیرے سامنے تو اب مجھے ایسا نہیں

کہنا چاہیے ــ"

رانو مسکرا دی ، جیسے رو رہی تھی یا رو دی ، جیسے مسکرا رہی تھی ۔

چنوں رانو کو دلاسا دیتے ہوئے کہنے لگی : " اس کی تو فکر نہ کر ، رانی ! جیسے وہ گیا ہے ، بی بیا ! ویسے ہی آ بھی جائے گا ۔"

اور دوپہر کے قریب منگل سچ مچ ہی چلا آیا ۔ اس نے نواب کا کرتا پہنا ہؤا تھا ، اسماعیل کا صافہ اور گوروداس کا کاسے شاہی جوتا ۔ بدن پر پٹیاں بندھی تھیں ۔ اس کا خیال تھا گھر کی ہلدی ولدی سے کچھ ہونے ہوانے کا نہیں ، اس لیے وہ صبح کے پہلے ہی پھیرے میں اسماعیل کے ساتھ اس کے اکے پر نکل گیا تھا اور ڈسکے کے بڑے اسپتال میں جا کر پٹی کروا آیا تھا ۔ صبح سے کچھ پیٹ میں ڈالا تھا یا نہیں ، خدا جانے ۔ کل سے تو صرف مار کھائی تھی اور یا پھر شادی کی تھی !

دن بھر منگل کھاٹ پر بیٹھا زمین کے تنکے گنتا رہا ۔ کبھی وزن میں اپنا آپا اسے ایک تنکے سے بھی ہلکا معلوم ہونے لگتا اور کبھی پوری زمین سے بھاری ۔ پھر کبھی بیچ میں جھک کر ، انگلی سے وہ کچی زمین پہ " اونسیاں " قسمت کی لکیریں کھینچنے لگتا لیکن جب انھیں گنتا تو وہ جفت ہی آتیں ، کوئی طاق نہ بچتی ۔ قسمت کہیں راستہ نہ دیتی ۔ جھلا

کر ہاتھ جھجھلاتے ہوئے اس نے اپنے بھاگوں کے سب لیکھ مٹا دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک اضطراری کیفیت سے چہرہ صاف کیا تو دھول منہ پر چلی آئی۔ اپنی طرف سے صفائی کے عمل میں وہ اور بھی گندا، تقدیر آلود نظر آنے لگا تھا۔

جب ہی ہاتھ اٹھا اٹھا کر وہ بکائن پر آ کر بیٹھنے والے، کرخت آواز میں کائیں کائیں کرنے والے ڈھوڈروں، پہاڑی کوؤں کو اڑانے، گاؤں کے کولی جوگے آوارہ کتوں کو ایک نیم جان، خارش زدہ کتے پر جھپٹنے سے روکنے لگا۔ پھر ایک طرف سے کہیں آدھی درجن کے قریب کتے، ایک دوسرے پر جھپٹتے، غراتے ہوئے چلے آئے جنہیں بھگاتے ہوئے منگل بول اٹھا: "میں حیران ہوں یار! کوٹلے میں جو بھی مرتا ہے، شاید کتا ہی بن جاتا ہے۔"

کچی دیوار پر سے دور وھولادھار اور ہمالہ کے سلسلہ ہائے کوہ کہیں ایک دوسرے میں کھپ گئے تھے اور ان کے بیچ کہیں کہیں برف چمکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ان پہاڑوں سے ادھر دکن کا وہ علاقہ تھا جس کی ٹیکریوں پہ پہاڑی کے سوز نے جنم لیا تھا کیوں کہ یہاں کے عاشق اور معشوق کبھی آپس میں نہ مل سکے تھے ایک اس ٹیکری پہ ہوتا تو دوسرا اس پر، اور بیچ میں دریا ——

پاپی لوگ پہاڑ دے، پتھر جن کے چت
انگ ملاوا کبھی کبھی، نین ملاوا نت

اور ان کی جدائیوں کا درد ، راوی ، چناب ، اور جہلم کے کنارے کنارے ہوتا ہؤا وارث شاہ اور قادر یار کے صوت میں ساندل اور گنجی بار کے دل تک پہنچ گیا تھا ۔ ایک ایک کرکے گذرے ہوئے واقعات منگل کے دماغ میں آنے لگے ۔ اس نے ایک سرد آہ بھری اور مرزے کی آواز میں گنگنانے لگا ۔

”تو نے برا کیا ، صاحباں! جو میری بکی کی اکاڑی باندھ دی ۔ میرے تیر و ترکش ٹانگ دیے ورنہ ایک تیر سے تیرے بھائیوں کو کھیت کر دیتا اور دوسرے سے اسے جس کی تو منگیتر تھی ۔“

لیکن ، شاید ، منگل کے فگار دل کے لیے مرزا صاحباں کا وہ حصہ کافی نہ تھا ۔ چناں چہ ایک کان پہ ہاتھ رکھ کر ، دوسری بانہہ الارتے ہوئے وہ گانے لگا : ” حجرے شاہ فقیر سے ایک جاٹنی عرض کرتی ہے : میں سالم بکرا تیری نیاز گزاروں اگر میرے سر کا سائیں مر جائے ، پانچ سات پڑوسنیں ہلاک ہو جائیں اور جو رہتی ہیں انھیں تپ آ لے ۔ گاؤں کے نمبردار کو پھٹکی پڑے جو تھانے رپٹ کرتا ہے ۔ کراڑ ہٹے کی ہاٹ جل جائے جہاں ہمیشہ دیا جلتا ہے ۔ فقیر کی کتیا مر جائے جو دن رات چوں چوں کرتی رہتی ہے ۔ گلیاں سونی ہو جائیں اور میرا محبوب بنا روک ٹوک کے آ سکے ۔“

یوں جی کو آسودہ کر کے منگل اندر جا کر لیٹ گیا ۔ جب

ایک چادر میلی سی

تک فضا میں سے کشت و خون نکل گیا تھا ۔ صبحیں ، دوپہریں اور شامیں ڈھلنے لگیں ، جیسے وہ کوئی میلی دیواریں تھیں اور کوئی آسمان کے دریائے درد سے مٹکوں پانی لے کر ، کرنوں کی جھاڑو سے انھیں دھو اگال رہا تھا ۔ رالو نے کھانا پکایا ۔ پھر بھاگ کر چنوں کے ہاں سے تھوڑا سا گھی لے آئی اور ایک بیوی کی طرح اس کی بڑی سی مقدار روٹی پر رکھ دی ۔ وہ روٹی پہ " چونگھا " نکالنے ہی والی تھی کہ کسی خیال کے آنے سے رک گئی ، شرما گئی اور ہاتھ کھینچ لیا ۔

کچھ دیر میں ، کھانا ڈالنے کے بعد ، اس نے بڑی سے کہا : " جا ، اسے دے آ ۔"

بڑی نے لتھنے پھلا کر شانے جھٹک دیے اور بولی : " میری جاتی ہے جوتی ۔"

رالو خجل ہو کر خود ہی اٹھنے والی تھی کہ پاس بیٹھا ہوا چوں بول اٹھا : " لا ، ماں ، میں دے آتا ہوں ۔"

رالو نے چوں کی طرف دیکھا ، جیسے یہ اس کا بچپن تھا ، اس کی معصومیت ہی تھی جو رالو کے دکھ کو سمجھ سکتی تھی ۔ یہ بچپن اور معصومیت جو کردہ و ناکردہ گناہوں سے کہیں اوپر تھے ۔ رالو کا جی چاہا اسے چھاتی سے لگا لے ، بھینچ لے ، یوں بھینچ لے کہ وہ پھر سے اس کے بدن میں تحلیل ہو جائے اور اس دنیا میں نہ آئے جہاں ..... ۔ جب ہی اس نے

تھالی چنوں کے آگے سرکا دی اور خود دوپٹے میں منہ چھپا کر رونے بیٹھ گئی ۔

یوں دن بیت گئے ۔ مہینے بیت گئے ۔ منگل کے دل میں آہستہ آہستہ ایک ذمے داری کا احساس جیسے اپنے آپ پیدا ہونے لگا اور وہ چار چار پانچ پانچ روپے کما کر گھر لانے لگا ۔ اگرچہ رانو کے ساتھ اس کا میاں بیوی کا رشتہ نہیں تھا اس پر بھی وہ روپے لا کر ماں کے ھاتھ میں دینے کی بجائے رانو ھی کے ھاتھ میں دیتا اور رانو خوش ہو اٹھتی اور اداس بھی ۔ ڈر سے ملا جلا ایک استحکام کا جذبہ اس کے دل میں جگہ پانے لگا ۔ گاؤں بھر کی عورتیں ، کیا چنوں اور کیا پورن دئی ، کیا ودیا اور کیا سروپو سب نے " کچھ ہؤا نی —— نی کچھ ہؤا ؟ " پوچھ پوچھ کر غریب رانو کا ناک میں دم کر دیا تھا ۔ رانو جواب میں صرف اتنا ھی کہتی : " رنڈیو ! شکر نہیں کرتیں میرا گھر بس گیا ھے ، روٹی کپڑا ملنے لگا ھے مجھے ؟ اب مجھے کوئی اس گھر سے نہیں نکالے گا ۔ کوئی میری بیٹی کو نہیں بیچے گا ۔"

لیکن وہ سب شہد کی مکھیاں یوں ھی چھوڑنے والی تھوڑے تھیں ؟ دیر تک وہ رانو کے ارد گرد بھنبھناتی رہتیں اور اس کے کولھوں میں چپے دے دے کر پوچھتیں :

"کیا مطلب ؟ ساری رات وہ ایسے ھی پڑا رھتا ھے ؟"

"ھاں ۔"

" تو اِدھر اور وہ اُدھر ؟ "

" ہاں ۔"

" تو بھی اسے بلانے کی کوشش نہیں کرتی ؟ "

" نہیں ۔"

" کیوں نہیں ، ناس پٹیے ؟ وہ تیرا وہ ہے ، شادی کی ہے تیرے ساتھ ، چادر ڈالی ہے تجھ پر ؟ "

رانو رونکھی ہو اٹھتی اور بول اٹھتی : " چادر ڈالی ہے تو کیا ہوا ؟ مجھے اب بھی وہ ویسے ہی لگتا ہے ، جیسے پہلے لگتا تھا ۔"

اس پر سب بُنکار اٹھتیں ، " ہو ہائے ! " " پھٹے منہ " " دُر لعنت " اور پھر وہی : " تمہیں نیند کیسے آتی ہے ؟ "

" جیسے پہلے آتی تھی ۔"

" وہ بھی سو جاتا ہے بس ایسے ہی ؟ "

" ہاں ۔"

" رات کو اٹھتا ، اکڑتا ، جماہی بھی نہیں لیتا ؟ "

اس پر سب ہنس پڑتیں اور ایک دوسرے کو " چھبیاں " دینے لگتیں اور آخر سمجھاتیں ۔ " تو کچھ کر کشتی جمانے کی ، نہیں تو ہاتھ سے جاتا رہے گا ۔"

پورو بیچ میں بول اٹھتی : " کہو تو تجھے ایک ٹونا لا دوں ؟ "

" ہاں نی " ودیا حامی بھرتی ۔
" نہیں نہیں " رالو کہتی : " میں کوئی ٹونا ووٹا نہ کروں گی ۔"
" تو پھر بیٹھ کے روئے گی " پورو تنبیہاً کہتی ۔
ودیا معنی خیز انداز میں پورو کی طرف دیکھتے ہوئے بول اٹھتی ۔ " تو تو نہیں روتی نا ؟ "
پورو ایک دم اپنی شرم اور لاج کو ایک طرف رکھتی ، اپنی جوتی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کہتی " میری روتی ہے یہ ۔ میں ٹوٹکا نہ لاتی ، میرا شمبھو پیدا نہ ہوتا تو یہی چاچا تمہارا مجھے گھر سے نکال دیتا ۔" اس پر سب کھلی کھاس کی طرح ہنس ہنس پڑتیں اور پورن دئی ایک بڑی سی آنکھ پھیلا کر ، سب کو چاروں طرف دکھا کر مارتی ۔ تس پہ چنوں پوچھ لیتی : " باوا ہری داس کے کتنے دن رہ گئے ؟ "
جب ہی پورن دئی چنوں کی چوٹی پکڑ کر یوں کھینچتی کہ سب " میں مر گئی ، ہائے میں مر گئی ۔" کے ہلڑ میں ختم ہو جاتا ۔
اُدھر نصیبوں والے اڈے پر گورو داس ، نواب اور اسماعیل منگل کی جان نہ چھوڑتے ، اکثر پوچھتے رہتے : " کیوں پور کیسی لگی ؟ " اور منگل کا چہرہ ایک دم لال ہو اٹھتا ۔ اسے یوں معلوم ہونے لگتا جیسے کسی نے اس کی ماں بہن کے بارے میں کوئی بات بے احتیاطی سے کہہ دی ہو ۔ وہ چپ

رہتا اور بیکار ہی کے ساز میں بکس کسنے ، یا گھوڑی کو تھپکنے لگتا ۔ گورو داس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہہ اٹھتا :
" سچ پوچھو تو دوھاجن کی بڑی موج ہوتی ہے ؟ "
" موج کیسی ؟ " نواب لقمہ دیتا یا اسماعیل یا کوئی اور ۔
" وہ پہلے ہی رسی بسی ہوتی ہے نا ؟ سب جانتی ہے ۔"
اس پر سب مل کر ھاھا ھوھو کرنے لگتے ۔ جس کے بیچ میں منگل کی پاٹ دار آواز آتی ۔" ٹھہرو تمہاری ماں کا ! " اور سب ایکا ایکی چپ ہو کر منگل کی طرف دیکھنے لگتے ۔ صرف گورو داس ہمت کرتا کیوں کہ وہ تن و توش کے اعتبار سے مضبوط تھا اور اس پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے ہر کسی کو سوچنا پڑتا تھا ۔ وہ کہتا : " اسے ماں بنانے کے لیے بیاہ کیا ہے ، اوئے ؟ چادر ڈالی ہے ؟ "
منگل ایک کڑی نگاہ سے اس کی طرف دیکھتا لیکن مصلحت کو بہادری سمجھ کر چپ رہتا ۔ تھوڑی دیر میں گدلائی ہوئی فضا صاف ہوتی اور اسماعیل کوئی لطیفہ شروع کر دیتا یا کثیفہ :
" ایک سردار جی کی اکنی کیچڑ میں گر گئی ؟ "
" پھر ، پھر کیا ہؤا ؟" نواب منگل کی طرف دیکھتے ، مزا لیتے ہوئے پوچھتا ۔ جب ہی بیچ میں کوئی سواری چلی آتی اور نواب اس سے مخاطب ہو جاتا : " کوٹلے چلے گی مائی ؟ "
" نہیں ویرا " مائی کہتی اور چلی جاتی ۔ نواب پھر اسماعیل

کو پکڑتا ۔ "ہاں تو سردار جی کی اکنی کیچڑ میں گر گئی ؟"

"ہاں ۔" وہ بیان جاری رکھتا ۔ "اور وہ کچھا پہنے ہوئے کیچ میں کود پڑے اور لگے اکنی ڈھونڈھنے اور اوپر ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہنے اللہ مل جائے ! یا اللہ مل جائے ۔ ایک مسلمین پاس سے گزرا ۔ اللہ کا نام سن کر ٹھہر گیا اور بولا : "اوئے سردارا ! تو ہمارے اللہ سے کیوں کہتا ہے ؟ اپنے واھگورو سے کیوں نہیں ؟ سردار جی نے اوپر دیکھا اور بولے اونہہ ! اکنی کے لیے واھگورو کو کیچڑ میں ڈالوں ؟ "

اس پر سب کھلی مار کے ہنس دیتے ۔ منگل بھی مسکرا الھتا اور اسماعیل اسے اجازت نامہ سمجھ کر اس کے پاس پہنچتا اور کہتا : "منگلا ! یہ ٹھیک ہے ، سرداروں کے بارہ بجتے ہیں ؟ "

"ہاں ، بجتے ہیں ۔" منگل اقرار کرتا ۔

"تیرے بھی بجتے ہیں ؟"

"ہاں ، میرے بھی بجتے ہیں ۔"

"پھر منگل کے "جونڈے" پہ ہاتھ رکھتے ہوئے اسماعیل پوچھتا : "یہاں کچھ ہوتا ہے ؟ "

"ہاں ہوتا ہے ۔" منگل پیچھا چھڑانے کے لیے مان لیتا ۔ لیکن اسماعیل اسی پر بس نہ کرتا ۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ کہتا ۔ "سن ..... یہ تمہیں دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے

یا رات کے بارہ بجے بھی ؟"

" دن کے ۔ جو اصلی سکھ ہے ، ایسے تو دن کے بارہ بجے ہی ہوتا ہے ۔ اتنے بال اور گرمی کتنی پڑتی ہے ۔"

" تو پھر ؟ " اسماعیل کہتا ۔ " وہ اپنے گاؤں کا وساکھا سنگھ ہے نا ترکھان ، وہ تو رات کے بارہ بجے بہت " کھروہ " کرتا ، شور مچاتا ہے ۔"

منگل جواب دیتا : " وہ حرام جادہ جرور مسلمان ہے سکھ ہوا ہوگا !"

اور سب مل کر ہنسنے لگتے ۔ منگل کی آواز سب سے بلند ہوتی ۔ پھر بیچ میں کوئی جاتون چلی آتی اور سب مل کر اسے لپک لیتے ۔ اس کی گٹھڑی نواب کے اِکے میں ہوتی جوتے منگل کے اِکے میں اور وہ خود گورودواس کی بانہوں میں ۔ اکثر ایسا ہوتا میاں ایک اِکے میں ہوتا اور بیوی دوسرے میں اور بچہ تیسرے میں ۔ پھر بہت ہی گالی گلوچ کے بعد سب مل کر کسی ایک کا اِکا بھر کر روانہ کر دیتے اور خود دوسری سواریوں کے پیچھے بھاگنے لگتے ۔ منگل کو اب عورتوں میں صرف سواری کی حد تک دلچسپی تھی ۔ وہ کبھی کسی نوجوان لڑکی کو دیکھتا بھی تو ایک سرسری نظر سے ، جیسے کہہ رہا ہو ، ہاں ایسی بھی ہوتی ہیں ۔ سلامتے میں اسے اب بھی دلچسپی تھی ۔ اس لڑکی کو عورتوں کی ڈاک سے پتا چل گیا تھا کہ منگل اور اس کی

بیوی میں ابھی تک کچھ وہ نہیں ہوا ۔ وہ اور بن سنور کر اس کے سامنے آتی اور میروں کے اشارے کرتی لیکن اندر سے وہ جلی بیٹھی تھی ۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا ۔ ایک دن منگل کو اپنے چنگل میں پھنساؤں گی ، ڈھارے کے پیچھے کپڑے اتراؤں گی ۔ اور جب وہ ہاتھ بڑھائے گا تو شور مچا دوں گی اور اس کی وہ بے عزتی کراؤں گی کہ یاد ہی کرے اب جب کہ وہ بیوی والا ہو چکا ہے ، اس کا منہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کالا ہو جائے گا ۔

اس دن نصیبوں والے اڈے پہ منگل نے نواب کے ساتھ پی لی لیکن ڈرتے ڈرتے ۔ اپنے بھائی کے زمانے میں تو وہ بوتلیں لنڈھایا کرتا تھا ۔ لیکن اب وہ ڈرتا تھا ۔ اسے پینے کی خواہش تھی لیکن یوں بے تکے پن سے نہیں ۔

رانو بھی عام عورتوں کی طرح تھی جو شادی کے پہلے ہی روز سے اپنے شوہروں کے چہرے دیکھنا سیکھ جاتی ہیں ۔ اس پر آنے والے ایک ایک شکن کو جاننے پہچاننے لگتی ہیں ۔ جب ان کا مرد کوئی گناہ کر کے آتا ہے تو انہیں لامحالہ پتا چل جاتا ہے ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ کچھ نہیں کہتیں ۔ باتیں کرنے میں وہ ان کی زیر زبر دیکھ لیتی ہیں بلکہ چوکھٹ کے اندر پہلا ہی قدم ان کی پوری جانچ ، پوری الف لیلیٰ ان کے سامنے دھرا دیتا ہے ۔ اس سے پہلے بھی منگل نے دو چار بار پی لی تھی اور وہ جان گئی تھی ۔ منگل کو بھی معلوم تھا کہ وہ

جان گئی ہے ۔ لیکن اس پر بھی خاموشی کا پردہ پڑا رہا اور ایسے ہی نبھتی رہی ۔

جوں جوں دن بیتنے لگے، گاؤں کی عورتیں ، رانو کو ڈانٹنے ڈپٹنے لگیں ۔ اور وہ سوچنے لگی ، شاید یہ ٹھیک ہی کہہ رہی ہوں ۔ وہ ڈرنے لگی ، اپنے مستقبل سے ، اپنے بچوں کے مستقبل سے کیوں کہ بیچ بیچ میں منگل الف ہو اٹھتا تھا : " ہٹاؤ یہ سب ۔ کیا تماشہ بنا رکھا ہے ۔"

اور رانو کانپ جاتی ۔ وہ منگل کو کچھ بھی تو نہ کہہ سکتی تھی ۔ اس پر اس کا حق ہی کیا تھا ؟ نہیں نہیں ، حق تو تھا ۔ پنچایت کی موجودگی میں ، گاؤں کے سب مرد عورتوں کی گواہی میں ، اس نے مجھ پر چادر ڈالی تھی ۔ سوچیں تو حق بھی ہے اور نہیں بھی ۔ چادر کا کیا ہے ؟ اڑھائی تین گز کا کپڑا ۔ ایسا کہیں تو شادی کے پھیرے بھی کیا ہیں ؟ یہ سب ٹھیک ہے ۔ نہیں ، کچھ بھی ٹھیک نہیں ۔ تلوکا بھی تو تھا اس سے وہ اتنی خائف نہ رہا کرتی تھی ۔ جو منہ میں آتا ، دھڑ سے کہہ ڈالتی ۔ چاہے بعد میں مار ہی کھاتی ۔ میں اسے کیوں نہیں کچھ بھی کہہ سکتی ؟ منگل رانو پر انگلی بھی نہ اٹھاتا تھا ۔ سوائے رات کے ، اس جگہ پر کھڑا بھی نہ ہوتا جہاں رانو کی پرچھائیں پڑتیں ۔ پھر بھی ؟ اس کا کیا مطلب ؟ چلو اچھا ہی ہے ، مار تو نہیں پڑتی ۔ ہڈیوں کو سینک تو نہیں کرنا پڑتا ، لیکن ..... بہت

دنوں تک سوچتے رہنے کے بعد رانو سمجھ گئی کہ وہ منگل کو کیوں کچھ نہیں کہہ سکتی ؟ دوسری عورتیں جو الاپ شناپ منہ میں آئے ، بک دیتی ہیں ۔ دن چھلا ، رات زیور کچھ نہ کچھ مانگتی ہی رہتی ہیں اور اسے ، لا کے دینا پڑتا ہے ۔

آج دن کچھ اندر باہر تھا ۔ جب منگل قصبے سے لوٹا ۔ سورج کی روشنی ابھی آسمان پر ہونے سے اشٹم کا بے نور چاند سفید سی پتنگ کی طرح ایک کیکر میں الجھا ہوا تھا ۔ اور اب اِکے کے ساتھ ساتھ بھاگتا ہوا ساہنسیوں کی ٹھٹی کے اوپر ، آسمان کے کھلے میدان میں جا کر ساکت ہو گیا ۔ جہاں منگل اپنا اِکا رکھ دیا کرتا تھا اور بکی کو تھوڑا چارہ وارہ ڈال کر گھر چلا آتا — پھر لوٹ آنے ، اسے کھریرا کرنے اور دانہ ڈالنے کے لیے ۔ باقی کا کام اگلی سویر پہ ملتوی ۔

اِکا اور بکی کا بندوبست کرنے کے بعد منگل لوٹا ۔ جہاں وہ اِکا کھڑا کیا کرتا تھا وہاں سے دائیں طرف فارم کی پندرہ پندرہ فٹ اونچی ایکھ کھڑی تھی جس کے بیچ میں سے چیونٹی بھی نہ گزر سکتی تھی ۔ البتہ جھینگر ، دن بھر انہی ہی دم میں سے لیس نکال کر ایک تار سا بناتے اور جھولتے جھلاتے ایک گنے سے دوسرے گنے تک پہنچ جاتے اور پھر اس کے رس میں ڈوب کر اگلے گنے کے پاس ۔ بائیں طرف مکان شروع ہوتے تھے جن میں سب سے اِدھر مدرسہ تھا اور اس کے ساتھ والا مکان جہلم

ارین کا جس کے اُدھر جا کر اب چاند تھم گیا تھا ۔

فضا میں سے ایک قسم کی خوشبو آ رہی تھی ۔ منگل جانتا تھا وہ خوشبو کیسی ہے ؟ بات یہ تھی گاؤں کے کسان ہر سال اسی مہینے رس نکالتے ، گڑ بناتے اور ایکھ کے بیچ میں تھوڑی سی جگہ خالی کرکے ، زمین کھود کے ، گڑ سے بھرا ہؤا مٹکا اس میں رکھ دیتے اور کیکر کی چھال اس میں ڈال کر اُوپر گوبر اور گھوڑے کی لید ڈال دیتے ۔ کچھ دن میں مٹکا چلنے " بولنے " لگتا اور بڑبڑ کرتی ہوئی شراب مٹکوں سے باہر چلی آتی ، ہوا میں بس جاتی ، فضا مکدر ہو اُٹھتی اور معطر بھی ۔

اب بھادوں اسوج میں ڈھل رہا تھا جب کہ گرم ہوا اور لُو کے عادی جسم سرد ہوا کا ایک بھی جھونکا برداشت نہیں کر سکتے ۔ ایک عجیب طرح کی چبھن اور کاہش انسان کے دل کے اندر پیدا ہونے لگتی ہے ، نہ آدمی چادر اوڑھ سکتا ہے ، نہ چھوڑ سکتا ہے ... عورتیں کسی خیالی کپکپی سے اثر پذیر ہو کر سب گودڑ اور روئی اندر سے نکال لاتی ہیں اور پھر دُھنیے کو بُلوا اس سے دُھنوا ، نئے لحافوں میں بھرتی ، اُن پہ کالے سوت کے " لگندے " ڈالتی ، لمبی تان کے سو جاتی ہیں — سردیوں کے لیے تیار ۔ اب ان کے لیے چاہے کہر پڑے یا برف ۔ لیکن مردوں کو ٹھنڈی ہوا کے ہر جھونکے کے ساتھ ایک اذیت ہوتی ہے ۔ ان کے جسم ایک دم سیاہ اور سرخ ہو اُٹھتے ہیں

اور مسام اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر مقابل کے مساموں سے ان گنت بار جفت ہونے کے لیے چل نکلتے ہیں ۔ مرد کا پورا جسم ایک پھنئیر سانپ کی طرح پھنکارنے لگتا ہے ۔

منگل گھر کی طرف قدم اٹھانے ہی والا تھا کہ بائیں طرف چھت پر سے آواز آئی — " منگلا وے ۔"

منگل نے اوپر دیکھا ۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں اشٹم کا چاند آ کر رک گیا تھا ۔ سلامتے کھڑی تھی اور اس کے دھندلے سے نقش دکھائی دے رہے تھے ، ایسے نقش جو اچھے بھلے آدمی کو پاگل بنا دیتے ہیں کیوں کہ وہ پورے نظر نہیں آتے ۔ سلامتے نے کہا : " ٹھہر ، وے ، مجھے تجھ سے کام ہے ۔"

منگل جامد و ساکت رہ گیا ۔ اس کے بدن میں اس وقت ایک ہی چیز حرکت کر رہی تھی ، اس کا دل ، جس نے تمام تر سکوت کی کسر نکال دی ۔ سلامتی ادھر سے آ رہی تھی جس طرف لکڑی کی سیڑھی جہلم کے گھر میں اترنے کی بجائے ، باہر اترتی تھی ۔ جس پر آزادانہ اتر چڑھ کر عنایتی اور سلامتی اور جہلم لال لال مرچیں سوکھنے کے لیے ڈالا کرتیں ۔ جتنا آدمی پوری زندگی میں کرتا ہے ، اتنا منگل نے سلامتی کے کوٹھے پر سے اپنے آپ تک پہنچنے میں سوچ ڈالا ۔ سلامتی آ کر منگل سے کچھ دور کھڑی ہو گئی ، چپ چاپ !

منگل نے پوچھا : " کیا بات ہے ، سلامتیے ۔"

"کچھ نہیں" سلامتی بولی - اس کی آواز میں شکایتیں تھیں، حکایتیں تھیں اور آنسو تھے - گویا وہ کہہ رہی تھی: "تیرے سامنے بیٹھ کے روؤں گی لیکن دکھ تجھے نہیں بتاؤں گی -"

"بتا نا" منگل نے کچھ آگے بڑھتے ہوئے کہا -

سلامتی تھوڑا پیچھے ہٹ گئی - جیسے وہ ڈر گئی تھی -

"پرے پرے" سلامتی بولی -

ایک خوشبو اڑ کر سلامتی کی طرف سے آئی - یہ خوشبو گاؤں کی خوشبوؤں میں سے نہ تھی - کیوں کہ ان خوشبوؤں سے منگل کے مشام پوری طرح سے واقف تھے - یہ شہر کی خوشبوؤں میں سے تھی جو محبت کو ایک قسم کی گوارا سی عفونت دے دیتی ہیں - بخلاف اس پسینے اور غلاظت کی بدبو کے جو تندرست بدنوں کی ناتمام محبت اور اس کی تب و تاب میں صندل ہو جاتی ہے - منگل کے دل میں اواخر بھادوں کی ہواؤں سے جو شعلہ ایکا ایکی بھڑک اٹھا تھا - اس "پرے پرے" سے اور بھی لپک اٹھا - سلامتی کے رکھ رکھاؤ کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ آگے بڑھا اور بولا:

"تو مجھ سے ڈرتی ہے؟"

"ہاں -" سلامتی بولی - "یاد نہیں اس دن؟"

"یاد ہے" منگل بولا - "پر سب دن ایک سے تھوڑے ہوتے ہیں - سلامتیے؟" اور وہ آگے بڑھ گیا - سلامتی پیچھے

ہٹی ، " نہیں ، نہیں ، نہیں ، نہیں " کہتی ہوئی دیوار سے جا لگی۔ اس نے سوچ رکھا تھا ۔ منگل کے ہاتھ پکڑتے ہی شور مچا دے گی اور اسے پکڑوا کر اپنی بے عزتی کا بدلہ لے گی ۔ ایک لمحے کے لیے اسے خیال آیا اگر یہ ریچھ کا بچہ ، اس ایک جست کے فاصلے کو ، جو اس کے اور منگل کے بیچ رہ گیا تھا ، پار کر کے اسے پکڑ لے اور اس کا منہ بند کر لے یا منہ کو بالوں سے بھرپور چھاتی میں بھینچ لے تو وہ کیا کرے گی ؟ اس کی ساری منصوبہ بندی دھری کی دھری رہ جائے گی ... اور وہ ریچھ ، آہستہ مگر یقیناً اس کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ سلامتی کی آواز گلے میں اٹک گئی ۔ وہ کانپ رہی تھی اور نہ جانتی تھی منگل پر بھی کوئی لرزہ چھا رہا ہے ۔ صرف ایک قدم ، اور سلامتی کے لیے اب سب کچھ ناممکن العمل ہو گیا تھا ، دونوں برابر ، آمنے سامنے کھڑے ایک دوسرے کی آنکھوں کو تلاش کر رہے تھے ، دو بلّوں کی طرح اندھیرے میں گھور رہے تھے ۔ ایسے میں صرف عورت کا دماغ کام کرتا ہے ، مرد کا نہیں ۔ جیسے پھر مرد کا کرتا ہے ، عورت کا نہیں ۔ اس ایک قدم کے فاصلے کو منگل کی بجائے سلامتی نے پاٹ لیا اور آچک کر منگل سے چمٹ گئی ۔ اس نے من جانے کے انداز سے منگل کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کا جارحانہ عمل روک لیا ۔ اور منگل ایک بیٹھی سی آواز میں بولا ۔ " بولو ، کیا کام تھا ؟ "

" کچھ نہیں ۔" سلامتی بولی ۔ " سوچا تھا ملے گا تو تجھ سے کہوں گی ـــ " اڑیا جتھے تیرے ہل وگدے ، اوتھے لے چل چرکھا میرا ۔" اور پھر وہ ہنس دی ۔

منگل نے پھر ہاتھ آگے بڑھائے ۔ سلامتی بولی : " پاگل ہو گیا ہے ۔ یہ بھی کوئی وقت ہے ، جگہ ہے ؟ "

" نہیں ، نہیں ۔"

" نہیں ۔"

" تو پھر کب ؟ کہاں ؟ "

سلامتی نے ایکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔" وہاں جب ادھر مندر میں گھنٹیاں بجیں اور مسجد میں ملا اذان دے ۔"

منگل نے پہلے ایکھ کی طرف دیکھا اور پھر آسمان کی طرف جہاں آتر پچھم میں کچھ پھوئیں پھوئیں سے بادل جمع تھے ۔ پھر سلامتی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا : " ہاں ، ٹھیک ہے ، کل ہزاری نے وہاں سے شراب کا مٹکا نکالا تھا ۔" اور اس نے ایکھ کی طرف اشارہ کیا : " بس مٹکے دو مٹکے جتنی ہی جگہ ہے " اور پھر اس نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا مگر اس کے پھڑکتے ہوئے ہاتھوں کو یقین نہ آ رہا تھا ، ان کے قابو میں کیا چیز آئی اور کیا نکل گئی ۔ اس نے اپنے آپ میں ہمت کی بھی کمی پاؤ اور سوچا ، آج دو گھونٹ شراب تیزاب کے اندر ہوتے تو مزہ جاتا اور پھر ، دن بھر اِکے اور دُھول کے بعد اُسے اپنا آپ کچھ گند

بھی لگ رہا تھا ، منہ سے ماں بہن کی گالیوں کی بو آ رہی تھی ۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے وہ بولا : " اچھا سلامتیے ، بھولنا نہیں ۔"

" میں نہیں ، تُو ہی بھول جائے گا ۔" سلامتی منگل کی نگاہوں کا شک دور کرتے ہوئے بولی ۔

" نہیں ۔" منگل نے کہا ۔

اور آدھے چاند کی رات میں منگل سلامتی کی نظروں کو اوجھل ہوتا چلا گیا ۔ بدن میں ایکا ایکی ایک تناؤ سا پیدا ہو جانے کی وجہ سے اس کی چال ہی بدل گئی ۔ ریڑھ کی ہڈی میں کوئی سانپ لہرانا بند ہو گیا تھا اور پیچھے سے دیکھنے پہ وہ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے انسان نہیں ، کوئی لٹھ جا رہا ہے ۔

سلامتی وہیں کھڑی کھڑی اسے جاتے دیکھتی رہی ۔ اسے بھی بھادوں کے جھونکے لگے تھے اور اس کا بدن ہوا میں پڑے سلگتے ہوئے کوئلے کی طرح کبھی بھڑک اٹھتا اور کبھی بجھ جاتا ۔ یوں معلوم ہونے لگا تھا جیسے آدھی رات کے وقت جب منگل آئے گا تو سلامتی شور مچانے ، اسے پکڑوانے ، ہٹوا دینے کے منصوبے کو عمل میں نہیں لائے گی ۔ گھر کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے اس نے اپنا تہ بند کسا کہ سامنے سے عنایتی ، سلامتے کی بڑی بہن آ گئی ۔

" تُو کہاں سے ، آپاں ؟ " سلامتی بولی ۔

" سرما دائی کے ہاں سے جوشاندہ لے کر آئی ہوں ۔"

" جوشاندہ ؟ " وہ کس لیے ؟ "

" مرنے کے لیے ۔" عنایتی نے بیزاری سے کہا ۔
سلامتی کچھ نہ سمجھی۔ عنایتی نے کچھ شرماتے ، کچھ مسکراتے ہوئے کہا ۔ " عورت ہونا بھی ایک لعنت ہے ۔"

" ہو ہائے ! " سلامتی نے کچھ پتا پاتے ہوئے کہا ۔ " روڈا پٹکی پڑا تو ابھی سال بھر کا بھی نہیں ہؤا ؟ "

" اسی لیے تو یہ مر رہی ہوں ۔" عنایتی نے کاڑھے کی بڑی سی پڑیا کو ماتھے کے ساتھ مارتے ہوئے کہا ۔ پھر دونوں مل کر گھر کی طرف چل دیں ۔ سلامتی بولی : " یہ سب کرنے سے پہلے تم نے مراد سے پوچھ لیا ؟ "

مراد عنایتی کے میاں کا نام تھا ۔

" آنہہ ! " عنایتی نے اپنی بانہہ جھٹکتے ہوئے کہا ، " اس نامراد سے پوچھنے بیٹھتی تو ابھی تک گیارہ ہوتے ۔ میرا پیٹ ہے کہ ملوک سنگھ کا آوا ؟ "

سلامتی کو جھرجھری سی آئی ۔ وہ اگرچہ بہت کچھ نہ جانتی تھی لیکن کائنات میں مادہ تھی جس کے رحم ہوتا ہے ، وضع حمل اور تولید کے نام ہی سے جس کے اندر ایک نا محسوس سی کسمساہٹ دوڑ جاتی ہے ۔ سلامتی نے کہیں دور کی بات سوچی ۔ آخر یہ ہوتا ہے ؟ یہی ہوتا ہے تو پھر ؟ جب تک عنایتی دروازے کے اندر پیر رکھنے جا رہی تھی ۔ سامنے اس نے مراد ، اپنے میاد کو اپنی سالی عائشہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے دیکھا اور الٹے پاؤں

باھر آ کر سلامتی سے بولی: " الیے! " پھر سلا تجھے وہ بھاٹیہ لڑکا ؟"
" کون ؟ " سلامتی نے کہا ، حالاں کہ جانتی تھی عنایتی
کہاں مار کر رھی ہے -
" ارے وھی ، اِکے والا منگلو ؟ "
سلامتی نے جب تک سوچ لیا : " نہیں " وہ بولی -
اس کے بعد اندر جا کر عنایتی ، عائشہ ، روڈے ، مراد وغیرہ
ی طرف متوجہ ھوگئی جہلم پھر ترکاری کے بدلے ، صبح گوشت
یں ڈالنے کے لیے چنے کی دال لینے گئی تھی -
ابّے کا ھمیشہ کی طرح کچھ پتا نہ تھا - سلامتی ایک کھاٹ پر
یٹھ کر سوچنے لگی - اس دن کا دھاڑنے والا منظر اس کی آنکھوں
کے سامنے پھر گیا اور وہ شرم اور خجالت سے لال ھو اٹھی - نہ
انے کیا ھوگیا مجھے ! ایسے بھی کوئی مانتا چلا جاتا ہے کسی
، بات ؟ وہ کہتا ، آتار دے اور بھی کچھ ، تو میں وہ بھی آتار
یتی - ہاگل ! کیسے پھر گلی میں آ کر کرتا پہنا اور اپنے یہ دوزخی
ھپائے - اللہ ! کوئی دیکھ لیتا تو ؟
کچھ ھی دیر میں سلامتی ، ابلنے ، کھولنے لگی : " بولا — ھو
ی سیر ، چلی جا اب ، اور مجھے جانا پڑا - اتنی بے عزتی نہ ھوئی
گی کسی ماں کی بیٹی کی - پر جس چیز کو آیاں - بے عزتی کہتی
، میں اسے بے عزتی نہیں کہتی - " پھر وہ اٹھی اور ھانڈی لے
سب کو کھلانے پلانے کے بہانے عنایتی کے پاس چلی گئی اور

جب سب جنے تھوڑے اِدھر اُدھر ہوئے تو اس نے عنایتی کو سنگل سے اپنی ملاقات کا واقعہ بتا دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ ملنے آئے گا ، مدرسے کے باہر ، ایکھ میں ۔

تھوڑی ہی دیر بعد مراد گاؤں کے دو چار بدمعاشوں کو لے آیا ۔ اپنی غریبی ، اپنے افلاس کے باوجود وہ یہ برداشت نہ کر سکتے تھے کہ ایک کافر کسی مسلمان لڑکی کی عزت پہ ہاتھ ڈالے سب نے مل کر جلدی جلدی لاٹھیاں ، چھویاں اور گنڈاسے جمع کر لیے اور پھر بیٹھ کر ، برسوں پہلے کے ، جاتن اور تلوکے کے قتل کی باتیں کرنے لگے ۔

(۸)

منگل نہا دھو چکا تھا اور اب اپنی داڑھی کو کچی گھانی کا تیل لگا رہا تھا ۔ صبح جب خیرے نے پڑے میں سرسوں ڈالی تو پہلی چند بوندیں بوتل میں منگل نے لے لی تھیں ۔ نصیبوں والے اڈے سے لوٹ کر ، سلامتی سے ملنے کے بعد ، منگل چھوں سے کھیلا بھی ، بڑی کی چوٹی بھی کھینچی اور ماں جنداں سے بڑی کے لیے " بابو " دیکھنے کی باتیں بھی کیں اور پورا گھر چہک اٹھا ۔

آج رانو اسے اچھی لگ رہی تھی ۔ ایسا معلوم ہوا جیسے اس کی شادی کو دو چار سال ہی ہوئے ہیں اور وہ بچے اس کی بڑی سوت کے ہیں یا وہ بڑا بھائی ہے اور چھوٹے بھائی کے قتل ہو جانے پر اس نے اس کی بیوی پہ چادر ڈال لی ہے ۔ نہیں نہیں ، یہ تو نہیں ہوتا ۔ چادر چھوٹا بھائی ہی ڈالتا ہے ۔ بڑے بھائی کے لیے تو چھوٹے کی بیوی بہو بیٹی کی طرح ہوتی ہے ۔

چونکہ منگل خود ، معمول کے خلاف ، آج شام کو نہا دھو کر صاف ستھرا ہوا تھا اس لیے رانو اسے غلط سمجھ گئی تھی ۔ وہ سمجھی یہ سب میرے لیے ہے ، آج کا دن میرا تھا ، رات بھی میری ہے ۔ رانو کو دیکھ کر منگل سمجھا یہ اس کی آنکھوں

کا قصور ہے ۔ لیکن نہیں ، آج رانو اپنی ہی آنکھوں ، اپنے ہی دل ، اپنے ہی گالوں ، ہونٹوں ، کولھوں ، رانوں کا قصور تھی ۔ آج صبح جب وہ " نہا کر جوہڑ میں سے نکلی تو سلفے کی لاٹ معلوم ہو رہی تھی ،" پھر اس نے گھر پہنچ کر دن میں کئی بار ابٹنا مل کر جلد کو اتنی نرم اور چکنا بنا لیا تھا کہ اس پر سے نگاہیں اور جذبے پھسل پھسل جاتے تھے اور پھر وہیں پڑے مچل مچل جاتے اور اس وقت تک الگ نہ ہوتے جب تک کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر نہ اٹھائے ، پھر اس نے بندی لگا رکھی تھی ۔ کوئی غور سے دیکھتا تو پتا چلتا آج وہ صرف بندی نہ تھی — وہ صبح کا سورج تھی جو گہرا سرخ ہوتا ہے اور تیز تیز اپنے محور کے گرد گھومتا جاتا ہے ، پھر ایکا ایکی جیسے کرنوں کے انبار میں ہاتھ ڈال کر کسی نے چھچھلا دیا ۔ اخروٹ کی چھال کا رنگ ہونٹوں پر چلا آیا اور اب تک کے سوکھے ہوئے چوھاروں کی بجائے وہ رس بھریوں کے ڈھیر معلوم ہونے لگے ۔ منگل نے ایک بار پھر ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا :

" 'تو آج باجار گئی تھی ؟ "

رانو نے ایک آچٹتی ہوئی نظر منگل پہ ڈالی اور پھر اسے اپنی طرف یوں دیکھتے پا کر نگاہیں چرا لیں اور دلہنوں کی سی دھیمی آواز میں بولی : " ہاں" اور پھر کام کاج کے بہانے ، اپنا آپ اِدھر اُدھر چھپانے ، وقت بتانے لگی ۔

ایک چادر میلی سی

رانو کیا چھپا رہی تھی ؟ یہ بات نہیں کہ وہ سگھڑ سیانیوں کی طرح اپنا سارا کچھ ایک ہی دم نہ دے دینا چاہتی تھی بلکہ کوئی بات تھی جو اپنے، بندی ، اخروٹ کی چھال اور رس بھریوں سے اوپر ہوتی ہے - جس کا تعلق عورت کی شکل و صورت سے نہیں ہوتا ، نہ اس کی نسائیت اور اس کی انتہا سے ، جسے وہ دھیرے دھیرے سامنے لاتی ہے اور جسے لاتی ہے ، تب پتا چلتا ہے ، یہ بات تھی ! جیسے اشٹم کا چاند اپنا آدھا چھپائے رہتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ ، روز بروز ، ایک ایک پردے — دوپٹے چولی ، انگیا ، سب کو الگ ڈالتا جاتا ہے اور آخر ایک دن ، ایک رات ، پورنیا کے روپ میں آ کر کیسی بے خودی و مجبوری ، کیسی ناداری و لاچاری کے ساتھ اپنا سب کچھ لٹا دیتا ہے - کیا علم النسا ، علم النجوم سے دور کی بات ہے ؟ کوئی بھی علم دوسرے علم سے فاصلہ رکھتا ہے ؟ جن لوگوں نے برسوں اور عادتاً آسمانوں پہ جھانکا ، ستاروں کو دیکھا ہو ، ان کی جھل مل کے ساتھ مرے ہل مل کے ساتھ جیے ہوں ، اماوس کے ساتھ مرجھائے ، پونم کے ساتھ کھلے ہوں ، وہی رجنی کی آنکھوں میں ، پلکوں کے نیچے ، زمینوں سے بڑی ، آسمانوں سے بڑی ، برق و مقناطیس کی وسعتوں میں جو راس رچائی جاتی ہے ، جو بھنگڑے اور جھمر اور لڈی ناچے جاتے ہیں ، ان کے راز سمجھتے ہیں —— وہی اشٹم کے چاند کا بھید بھی جانتے ہیں -

منگل ، اکے والا ، پھر سلامت میں بے سلامت ہوکر اس گھر کی اشٹم کا بھید کیسے سمجھتا ؟ اس نے کبھی آسمانوں پہ جھانکا ہی نہ تھا ۔ وہ تو یہ بھی نہ جانتا تھا وہ خود ایک ستارہ ہے ۔ سورج ، جو کبھی کسی کو اپنی طرف دیکھنے کی اجازت نہیں دیتا ۔ جو دیکھتا ہے اندھا ہو جاتا ہے اس کے طلوع و غروب اس کے توازن و اعتدالِ شب و روز آپس میں سر ٹکراتے ، مر جاتے ، سلف کا حصہ ہو جاتے ہیں ۔ بنات النعش اس کی طرف دیکھتی ہوئی معدوم ، چالد بے نور ، کاغذی ہوکر گھٹتا گھٹتا گھٹ جاتا ہے اور آخر عدم کی پنہائیوں میں گم ہو جاتا ہے اور وہ — سورج بے خبر ۔

لیکن آج اس بے خبر سے منگل کو رانو کچھ خبریں دینا چاہتی تھی ۔ وہ اس گھونگھٹ کو اٹھادینا چاہتی تھی جو منگل اور اس کے بیچ حائل ہو رہا تھا ۔

گھنڈ انھیاں کرے سوجا کھیاں نوں
گھنڈ لاہ منہ آتوں لاڑے نی
وارث شاہ نہ دبیے موتیاں نوں
پھل اگ دے وچ نہ ساڑے نی

" گھونگھٹ دیکھنے والوں کو اندھا کر دیتا ہے ۔ اے دلہن ! تو اسے مکھڑے پر سے ہٹا دے ۔ وارث شاہ ! موتیوں کو دفنا کر نہیں رکھتے نہ پھولوں کو آگ میں جلاتے ہیں "

... اور آج رانو نے اس پردے اور حجاب کو دور کر دینے کی

ٹھان رکھی تھی جسے بیچ سے ہٹائے بغیر خدا بھی نہیں ملتا ۔

اُدھر منگل آج جیسے کوئی رشوت دینا چاہتا تھا ۔ اس نے کرتے کی جیب سے رانو کے لیے بالوں کی کچھ سوئیاں نکالیں ، لوٹتے ہوئے جنہیں وہ قصبے سے لے آیا تھا ۔ انھیں ہاتھ میں لیتے ہی رانی چونک اٹھی ۔ اس کے منہ سے ایک بے خودی کے عالم میں ہا نکلی ۔ عورت میں لذت کی انتہا ، لیکن منگل کہیں دور دیکھ رہا تھا ۔ پھر لوٹ کر اس نے پیسے نکالے اور رانو کے ہاتھ میں تھما دیے ۔ رانو کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے لیکن اس نے حیران ہو کر پوچھ ہی لیا :

" یہ آٹھ روپے کہاں سے آ گئے ؟ "

" آج بسرور کی سواری لگی تھی ۔"

" تو ؟ "

" تو کیا ؟ کھاؤ ، خرچو ۔" اور پھر پہلی بار ، اپنی بیاہتا زندگی میں پہلی بار ، اس نے معنی خیز نگاہوں سے رانو کے سنگھار کی طرف دیکھا اور بولا ۔ " خرچ بھی تو بڑھ گیا ہے ! "

اور رانو پہلی بار اپنی نئی بیاہتا زندگی میں پہلی بار ، ایک بیوی کی طرح شرمائی اور اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا آہٹنا ، اس کی مہندی ، اخروٹ کی چھال ، اور رس بھریاں ننگی ہوگئیں ۔ اس نے سمٹنے کے پردے سے اپنا سب کچھ ایک بار ڈھک لیا ۔ وہ منگل کے قریب ہونے میں کتنی دور اور دور ہونے میں کتنی

قریب ہو ہو جاتی تھی ۔ پھر اس نے بھی سوچا ، ابھی نہیں ۔ ابھی تو مندر میں گھنٹیاں بھی نہیں بجیں ۔ مسجد میں ملا نے اذان نہیں دی ۔

منگل نے کہا : "کھانا نکال دے جھٹ سے ۔"

"ابھی نہیں ۔"

"کیوں ؟ ابھی کیا ہے ؟"

رانو کچھ گھبرا سی گئی ۔ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکی ۔ لیکن منگل نے خود ہی ایک انجانے پن میں اسے اس دبدا سے نکال لیا : "کیا کوئی بہت اچھی چیز پکی ہے ؟"

"ہاں" رانو نے کہا اور پھر کھٹے سے اس کے دوہٹے میں کوئی توتا بولنے لگا : "چنے کی دال پکائی ہے ۔ ساتھ پودینے کی چٹنی کراری ، مسالوں والی ـــ"

کتنی بھول ہوئی ! منگل کو وہ سب یاد آ گیا ۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ۔ اس کے نتھنے پھولنے لگے ، اور بال جیسے اپنے آپ پگڑی سے باہر آ گئے ۔ اگر بالوں میں نہیں تو خیالوں میں ضرور اس دن والی من چھٹیاں ، آک کی بڈھی مائیاں اڑی ہوئی تھیں ۔ وہ ایک دم خفا ہو کر بولا ۔ "دو ، جو بھی پکا ہے نہیں میں جاتا ہوں ، ضروری کام ہے ۔"

رانو سنبھلتے سنبھلتے پھر گر سی گئی ۔ اس نے تو کچھ اور ہی سوچا تھا ۔ اور ہی پکایا تھا ۔ شاید کوئی ایسی ویسی بات نہ بھی

ہو ۔ اچھا ہی ہے ، جب لوٹے گا بچے سو چکے ہوں گے ۔ سسر کی کھوں کھوں ، کھانہہ کھانہہ ، ساس کے شروع رات کے خراٹے بند ہو چکے ہوں گے ۔ ایسی خاموشی ہو گی کہ سانس بھی روکنے پڑیں گے ۔ ایکا ایکی منگل نے کہا :

" میری وہ کُرتی کہاں ہے ؟ "

رانو سمجھ گئی ، سنسنا گئی ۔

" کہاں جا رہا ہے ؟ " اس کے منہ سے بے اختیار نکل آیا ۔ دیکھتے نہیں ، بادل گھرے ہیں ؟ "

" ہوں گے ۔" منگل نے کہا ۔ " تُو کون ہے روکنے والی ؟"

رانو بے بضاعت سی ہو کر رہ گئی ۔ بولی ۔ " نہیں میں تو کوئی نہیں ۔ ایسے ہی پوچھا تھا ۔"

اگر رانی اڑ جاتی ، جیسے تلوکے کے ساتھ اڑ جاتی تھی اور کہتی : " میں نہ روکوں گی تو اور کون روکے گا ؟ " تو منگل الف ہو جاتا ۔ لیکن وہ اپنی ، پھٹی ہوئی ، میلی ، بوسیدہ سی چادر کے رشتے کو سمجھتی تھی ۔ منگل رانی کے اس مریل سے جواب سے کچھ ڈھیلا ہوگیا اور بات کو ختم کرنے کے انداز میں بولا : " جا رہا ہوں رنڈی کے ہاں ۔"

یہ فقرہ شوہر عموماً اس وقت کہتے ہیں جب وہ واقعی رنڈی کے ہاں جا رہے ہوں اور بیویاں سمجھتی ہیں ان کا میاں کسی غلط جگہ پہ نہیں جا رہا ورنہ نہ وہ ایسے کہتا ؟ لیکن رانو

کو حالات میں ہر لحظہ پیدا ہو جانے والے خطرے نے ایک ایسی سمجھ دی تھی جو اس کی دوسری بہنوں کے حصے میں نہیں آئی تھی ۔ ایکا ایکی وہ دیوی سے ایک عام ، گوشت پوست کی عورت بن گئی ۔ ایک دم چالاک اور عیار ، حرافہ ! کیا کرتی ؟ وہ مجبور تھی اور بے بس ۔ آدمی پل پل حالات اور واقعات سے اثر پذیر ہوتا ہے ، ان کے ساتھ بدلتا ہے ، ورنہ پرماتما نے اسے اتنا بڑا نسوں کا جال نہ دیا ہوتا ۔

کرتی کے مطالبے نے رانو کے شک کو یقین میں بدل دیا ۔ وہ تن کر کھڑی ہو گئی ۔ اس کے بھی نتھنے پھولنے لگے جو منگل کو رانی کے ڈوپٹے میں دکھائی نہ دیے ۔ ایک بیوی مقابلے کے لیے ، اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے ، ایک بیسوا کی سطح پر آ گئی تھی ۔ اپنی نگاہوں کے افق پہ اسے سلامتی کا بدن لہراتا ہوا نظر آیا ، جس کے بدن کے کسے کسائے اور متناسب اعضا میں مقابل کے لیے قدرتی جگہیں بنی تھیں ، جس کے جسم کی تازگی اور شادابی کو آہنے اور ہندی اور اخروٹ کی چھال کی ضرورت نہ تھی ، جو سب چیزیں منگل سے استھول ، پتھر آدمی کے لیے بے کار تھیں ، جو خود چٹان تھا ، چٹانوں سے بھڑنا چاہتا تھا ، خود لوہا تھا ، لوہے سے ٹکرانا چاہتا تھا ، اور رانو جانتی تھی اور اس کے لیے تیار تھی ۔ اس نے ایک آڑی نظر سے ٹرنک کی طرف اشارہ کیا اور بولی :

" وہاں پڑی ہے تیری کُرتی ۔"

جب ہی باہر سے ودیا کی آواز آئی : " رانو ۔"

رانو ایک دم باہر لپکی اور اس سے پہلے کہ ودیا کچھ کہتی رانو نے اُسے باہر دھکیلتے ہوئے کہا : " چلی جا ، ودو ، اس وقت چلی جا ۔"

ودیا نے بےکار سی ضد کرتے ہوئے کہا : " کیوں نی ؟ "

رانو ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی : " پرماتما کے لیے ، بڑے بڑوتوں کے لیے ۔"

اور ودیا حیرانی سے پیچھے دیکھتی ہوئی چلی گئی ۔

رانو اندر آئی تو منگل ٹرنک کھول چکا تھا ۔ اس نے کچھ کپڑے اِدھر اُدھر بکھیر رکھے تھے ۔ اس کے ہاتھ میں مٹھے مالٹے کی بوتل تھی اور آنکھوں میں چمک ۔

" یہ کہاں سے آئی ؟ " اس نے رانو سے پوچھا ۔

" یہ کیا ہے ؟ "

" یہ " منگل نے بوتل کو ہوا میں اُٹھاتے ہوئے کہا ۔ " مٹھے مالٹے کی بوتل ! "

رانو نے کچھ لرزتے ، کچھ باہر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ۔ " مجھے کیا معلوم ؟ " اور اسے بہت کچھ اپنا آپ چھپانے کی ضرورت بھی نہ پڑی ۔ ڈبو رونے لگا تھا ، رانو نے آدھی اندر آدھی باہر جا کر بانہہ اُلارنی شروع کر دی تھی : " ہات ، ہات

موئے ! یہاں کیا دھرا ہے ، تیرے رونے کو ؟ رو ان کے ہاں جا کر ، جن کے ہاں ترکاری ملتی ہے ، گوس ملتا ہے ۔" اور پھر مڑ کر بولی : " تیرا بھائی پیا کرتا تھا نا ۔"

" ہاں مگر " منگل نے حیرانی سے کہا ۔ " اتنے برسوں سے ؟ "

" پڑی رہی ہوگی ، میں نے تو جب سے اس ٹرنک کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ۔"

منگل بوتل گھما گھما کر دیکھ رہا تھا جیسے یقین نہ آ رہا ہو ، بالکل وہی شراب تیزاب جس کی اس شام اسے طلب تھی ۔ جس سے اس نے چاہا تھا کہ اس کی ہمت بڑھے چیتے کی سی لپک آ جائے ، دس گھوڑوں کی سی طاقت ۔ اسے بھی اپنے ذہنی افق پر ایک تر و تازہ ، تندرست و توانا لڑکی دکھائی دی ، اس نے تھوڑا اندر باہر ہو کر اوپر ، آسمان کی طرف دیکھا جہاں اب بادل گھر آئے تھے اور چاند کو اپنے لحاف و توشک میں چھپا لیا تھا ۔

ضرور کہیں گرمی پڑی ہوگی ، بخارات اٹھے ہوں گے جو اس مہینے ، بھادوں کے آخر میں کوئلے کے اوپر چھا گئے ۔ شاید کہیں رات اور دن برابر ہونے والے تھے ۔ بادلوں کے بیچ میں سے اپنا گریبان پھاڑ کر دیکھتے ہوئے ستاروں سے اس بات کی تسلی کر کے کہ ابھی پہلا ہی پہر شروع ہے ، منگل لوٹ آیا ۔ لیکن لوٹنے کے

بعد وہ پہلا سا منگل نہ رہا تھا ۔ ایک عجیب قسم کی کرختگی اس کی نگاہوں میں چلی آئی تھی ۔

" میں کبھی کبھی وہاں نصیبوں والے اڈے پر لگا لیتا ہوں ۔" وہ انگوٹھا اور مٹھی منہ کی طرف لے جاتے ہوئے بولا ۔

" میں جانتی ہوں ۔" رانو نے کہا ۔

منگل نے پروا نہ کی ، نہ کسی استعجاب کا مظاہرہ ، پھر اس نے بوتل کی طرف دیکھا ۔ حرص و آز نے بہت کچھ اسے دیکھنے نہ دیا ۔ مثلاً رانو کی آنکھوں میں اُمڈ آنے والا سیل ، ساتھ ہی اس کا تیز ہوتا ہؤا تنفس ۔

" تیرے سامنے تو نہ پیوں گا " وہ اپنی ہی رٹ لگاتے ہوئے بولا ۔

رانو چوکنی ہو گئی : " کیوں ؟ "

" تو برا مانتی ہے نا ؟ "

رانو کہے جا رہی تھی ۔ " نہیں ، میں کیوں برا مانوں گی ؟ میرا حق ہی کیا ہے ؟ " لیکن اندر سے کسی آواز نے اسے روک دیا ۔ اس کی نگاہیں پھر ایک حرافہ کی نگاہیں ہو گئیں اور وہ بولی ، ہاں ، تو جانتا ہی ہے ، مجھے زہر لگتی ہے ۔"

پھر ، جیسا کہ رانو کا اندازہ تھا ، جیسا کہ وہ منگل کو جانتی تھی ، جیسا کہ وہ چاہتی تھی ، منگل ایک دم بھنّا اٹھا ۔ ایک دم بوتل کے گلے میں مٹھی گھماتے ہوئے اس نے کاگ کو

ڈھیلا کر دیا، پہلے چوروں اور پھر ڈاکوؤں کے انداز میں بولا :
یہی ہے نا تم عورتوں کی بات ۔ کھانے پینے سے بھی روکتی ہو
اپنے مردوں کو ۔" اور وہ جھینپ گیا ۔

رانو خوش ہوئی ۔ زبانی ہی سہی : مگر "عورت" اور "مرد"
کا رشتہ تو قائم ہوا ۔ اوپر سے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے بولی :
" خبردار میں نہ پینے دوں گی ۔"

بالکل جیسا کہ رانو نے سوچا تھا ۔ منگل نے کاگ نکال کر
باہر پھینک دیا ۔ بو سی نکلی اور سارے کمرے میں پھیل گئی ۔
رانو نے ایک ہاتھ سے دوپٹہ ناک کے سامنے کر لیا اور دوسرا
ہاتھ منگل کے ہاتھ اور بوتل کے منہ پر رکھ دیا ۔ منگل نے
رانو کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولا : میں پیوں گا ضرور پیوں گا ۔"

"تو نے اپنے بھائی کو ہٹکایا تھا ، بوتل توڑی تھی ، مجھے
چھڑایا تھا ۔"

" وہ ، وہ تو تجھ پر ترس کھایا تھا ۔"

پھر ، جیسا کہ رانو نے سوچا تھا ، منگل نے اس کے ہاتھ
جھٹکنے شروع کر دیے ۔ بیچ میں بڑی آ گئی اور دونوں کو
ایک دوسرے کے اتنا قریب پا کر ٹھٹک گئی ۔ جب ہی باہر
سے بادل کی گرج سنائی دی ۔ " جا "تو" رانو اسے دیکھ کر
بولی " کھانا کھلا دے ، سلا دے سب کو اندر ، پانی پڑنے
والا ہے ۔" بڑی نے باہر جاتے ہی اپنے پیچھے دروازہ بند کر

دیا ۔ آج وہ صبح ہی سے ماں کے تیور دیکھ رہی تھی اور کچھ کچھ سمجھ بھی رہی تھی ۔

رانو بھر بوتل پر جھپٹنے لگی اور منگل اسے دھکیلنے لگا ۔ اس کے سخت اور کھردرے ہاتھ ، رانو کے بدن کے ہر حصے کو لگ رہے تھے ۔ بیچ میں اس نے کچھ رکھ رکھاؤ کیا بھی ، لیکن چادر کا بیع نامہ تھا جو رانوں کا بدن توڑ رہا تھا ، مروڑ رہا تھا ۔ وہ بار بار ایک دم بوتل سے منہ لگا کر پیتے ہوئے ، ہانپتے کانپتے کہہ رہا تھا : " میں اپنے بھائی کی طرح نامرد نہیں جو ایک عورت کے سامنے ہتیار ڈال دے گا ۔"

منگل نے اس چھینا جھپٹی میں ایک تہائی بوتل خالی کر دی ۔ رانی کچھ اور لپکی ۔ منگل نے اب کے اسے نیچے فرش پر گرا دیا اور پھر جوش کے عالم میں اسے زدو کوب کرنے لگا ، بالکل ایسے ہی جیسے رانو نے سوچا تھا ۔ وہ اوپر اٹھنے کی کوشش کرنے لگی اور منگل اسے نیچے دبانے کی ۔ بیچ میں ایک ہاتھ سے بوتل اٹھا کر وہ پھر پی گیا ۔ ہولے ہولے اس کا چہرہ لال ہونے لگا ۔ خون کانوں اور سر کی طرف آنے لگا ۔ رانو کی سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی ۔ اس کے اعضا میں ایک ایسی تڑپ پیدا ہو گئی جسے زیر کرنا مشکل ہو گیا ، ناممکن ۔ اب کے جو رانی اٹھی تو منگل نے اسے دیوار کے ساتھ دے مارا ۔ خون کا ایک فوارہ رانو کے سر سے چھوٹا اور اس کی ٹانگیں

اسے سنبھالنے کے قابل نہ رہیں - وہ زمین پر پڑی تھی ، آنکھیں بند اور منہ کھلا ہؤا - رانو کی خاموش بغاوت کے باوجود آواز اندر جنداں تک پہنچ گئی اور وہ بولی :

" کیا ہے بہو ؟ "

ایک عجیب قسم کی لذت سے بے ہوش ہوتے ہوئے رانو نے جواب دیا : " کچھ نہیں ، تائی ، بلی ہے ! " اور پھر اس پر ایک غنودگی سی چھانے لگی - اُن کے اعضا ڈھیلے پڑ گئے - جہاں هاتھ پڑا تھا ، ہاتھ ، ٹانگ پڑی تھی ، ٹانگ اور جہاں کپڑا پڑا تھا ، کپڑا - لیچڑ جواب کری تھی یا پانی - رانو کی شلوار تربتر ہو رہی تھی - اب تک جو کچھ ہؤا اس سے یہ نہ معلوم ہوتا تھا دونوں میں سے کس نے پی ہے ؟ نشہ کسے آیا ہے ؟ کس کا اترا ہے ؟

منگل رانو کے پاس حیران کھڑا تھا - عجیب عورت ہے ! اتنی مار پڑی اس پر بھی کہہ دیا ، بلی ہے ! وہ شرمسار تھا اور شکر گزار بھی -

پگڑی پھاڑ کر اس نے رانو کے زخم پونچھنے شروع کر دیے اور پھر کپڑے کو مٹھی میں رکھ کر اس پر سانس کی دھونکنی چلانے لگا - رانو کے بدن پہ جہاں جہاں سوجن تھی ، لگانے لگا ، ویسے ہی جیسے اس رات رانی نے کیا تھا - رانی کو آرام آ رہا تھا ، حظ آ رہا تھا اور منگل کو رونا ، اور اس رونے میں

کنارے کی تسکین - روتے روتے اس نے رانی کے پاؤں پکڑ لیے - اب وہ اسے اوپر کھینچ رہی تھی ، اس کا بدن سہلا رہی تھی ، جیسے مار اسے نہیں ، منگل کو پڑی ہے -

" معاف کر دے ، مجھے معاف کر دے -" منگل رٹ لگائے جا رہا تھا -

" وعدہ کر ، پھر نہ پئے گا -" رانو نے اس کے ساتھ لگتے ہوئے کہا اور پھر ایک دم کسی خطرے سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے، پیش قدمی کرتے ہوئے بولی : " وعدہ کرے گا تو میں آج تجھے اپنے ہاتھ سے پلاؤں گی -"

" میں وعدہ کرتا ہوں -" منگل نے کہا اور پھر سوچنے لگا ، اس نے کس بات کا وعدہ کیا ہے ؟ ! رانو آہستہ سے اٹھی اور باہر چلی گئی - منگل بیٹھا برتنوں پر بارش کی جلترنگ سن رہا تھا - بڑی نے سب کو کھلا پلا دیا تھا اور کہیں دور ، اندر سلا دیا تھا جیسے ہمیشہ کے لیے ، جیسے انسان اور قدرت کے درمیان اس عظیم سازش میں وہ بھی شریک ہو گئی تھی - رانو نے تنور کو برسات سے بچانے کے لیے اس پر ایک بڑا سا دابڑا رکھ دیا اور پھر کھانا لے کر اندر چل دی -

رانو لوٹی - تھالی میں ایک طرف روٹی پڑی تھی اور دوسری طرف کچھ پیاز اور چانپیں ! منگل نے حیران ہو کر چانپوں کی طرف دیکھا اور پھر رانی کی طرف اور اس کے منہ میں

پانی آنے لگا ۔ رانو نے گلاس میں ایک دم بہت سی شراب انڈیل دی اور منگل کے ہاتھوں میں تھما دی ۔ منگل کو جیسے یقین نہ آ رہا تھا ۔ کھانے سے نظریں ہٹا کر اس نے رانی کی طرف دیکھا جس کی نگاہیں پیالے بنی ہوئی تھیں ۔ پھر وہ انکار نہ کر سکا ۔ گلاس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولا :

" آج کے بعد پیوں تو سمجھو گائے کھاؤں ۔"

اس نے گلاس منہ کی طرف اٹھایا تو رانو نے روک دیا : " ٹھہرو " جیسے اسے کوئی بات یاد آ گئی — وہ باہر گئی اور تھوڑی دیر کے بعد لوٹی تو ہاتھ میں ایک ٹوٹی ہوئی چینی کی رکابی تھی اور اس میں دل کی شکل کا ایک ٹماٹر ، جو آٹھ حصوں میں کٹا پڑا تھا !

منگل پینے اور کھانے لگا ۔ رانو رو رہی تھی ۔ ایسا مزہ منگل کو نصیبوں والے اڈے پہ کہاں آیا تھا ؟ روتے کانپتے ہوئے رانو نے اور انڈیلی ، اور ، اور ..... اور شراب رانی کو چڑھ گئی ، رانی کو ! چھپنے کے بجائے وہ کھلنے لگی ۔ پہلے جالی کا دوپٹہ جیسے اتفاق سے گر گیا ۔ پھر کرتے کے تکمے کھل گئے ۔ جب ہی مندر کے گھنٹے سنائی دیے ، پھر مسجد سے اذان ۔

" ہات ! " منگل نے گھنٹے اور اذان سنتے ہوئے کہا ۔

" ہات کیا ؟ " رانو پوچھنے لگی ۔

" یہ " منگل نے اپنا غیر یقینی ہاتھ جہلم اروِن کے گھر

کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا : " یہ ملا اور پنڈت ۔"

اور اس نے اٹھنے کی کوشش کی ، دروازے تک گیا بھی لیکن باہر گھپ اندھیرا دیکھ کر ، لڑکھڑاتا ہؤا اپنی جگہ پہ آ رہا ۔ پھر ایکا ایکی اپنی آنکھوں پر پورا زور ڈالتے ہوئے وہ سامنے دیکھنے لگا ۔ رانی کھڑی تھی ۔ پونم کا چاند ! جو بے صبر ہو کر آدھے سے پورا ہو گیا تھا ، اور بادلوں کے لحاف و توشک کو چیرتے ، پھاڑتے ہوئے ، نیچے زمین پر اتر آیا تھا ۔

منگل اٹھ کھڑا ہؤا اور سانس روک کر دیکھنے لگا ۔ بہ مشکل تمام بولا : " تم ..... تم نے کپڑے کیوں پہنے ہیں ؟ "

رانو نے اپنا پھٹا پرانا جالی کا دوپٹہ اٹھایا اور اسے اپنے اور منگل کے بیچ تانتے ہوئے بولی : " لو ، اتار دیے ۔" اور دوپٹے کو دو اٹھے ہوئے ہاتھوں میں تھامے ، رانو پہلو کی طرف مڑی ۔ عورت کا حسن ثلاثہ منگل کے سامنے تھا جس سے گیہوں کی روٹی کھانے والا کوئی بھی مرد انکار نہیں کر سکا ، اور بیچ میں لطیف سا پردہ ۔ پھر ، اس حسن پر ایک انگڑائی ٹوٹی ۔ سال کے باون ہفتے ، ہفتے کے سات دن ، دن کے آٹھ پہروں ، گھنٹوں اور پلوں میں ایک ایسا لمحہ ضرور آتا ہے ، جب چاند لپک کر سورج کو سر سے پاؤں تک گہنا دیتا ہے ۔

منگل کے چہرے پر سرخیاں اور سیاہیاں دوڑ گئیں ۔ آنکھیں بند ہو گئیں اور جسم کے مساء اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں

چل دیے۔ کبھی بارش کے ڈر سے چھپتے، کبھی اس کے لیے باہر آتے۔ ساون اور بھادوں میں تو بارش ہمیشہ ہوتی ہے۔ جہاں تہاں بھی ہوتی ہے لیکن بڑوں کا کہنا ہے کہ جب بھادوں اور اسوج کے بیچ دن اور رات ملتے ہیں، برابر ہوتے ہیں تو دیوی کے کوٹلے پر ضرور چھینٹے پڑتے ہیں، بے شمار پڑتے ہیں۔ منگل نے ایک اندھے کی طرح لپک کر، اندازے ہی سے رانو کو کلاوے میں لے لیا۔ پھر ایک ہی لمحے میں وہ جسم کے تپتے ہوتے زعفران زاروں پہ تھے۔ اس سے پہلے کہ ان کے سانس تیز ہوتے ہوتے وہاں پہنچ جاتے جہاں سے وہ پھر لوٹ کر نہیں آتے، منگل رانو سے کہہ رہا تھا: "آج تم ..... کتنی کھوب شورت لگ رہی ہو، بھابی!"

(۹)

گھر کے دروازے میں کھڑی ، آسمان سے مسلسل بارش پڑتے دیکھ کر سلامتی جھلا رہی تھی ، اپنے تاکوں پہ ہلکے ہلکے تھپڑے لگا رہی تھی - پھر وہی ہاتھ اس نے کولہوں سے نیچے تھپکنے شروع کر دیے اور سی سی کرنے لگی ، جیسے غلطی سے اس نے ایک ساتھ بہت سی مرچیں کھا لی ہوں - گھنٹے اور اذان کی آخری گونج اس کے کانوں سے معدوم ہو رہی تھی اور وہ مُلاؤں اور پنڈتوں کو کوسنے دے رہی تھی جنھوں نے انسانی جسم بنایا تو نہ تھا ، البتہ اس سے انکار ، اسے گالی دینے کو ہمیشہ تیار رہتے تھے -

رات کے دوسرے پہر کا آخر تھا اور بارش تھی کہ ہٹ ہٹ کے پڑ رہی تھی - مدرسے کے برآمدے میں ، ایکھ کے برابر کھڑے مراد نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا :

" بکواس ہے یار ، یہ عورت بھی -"

خلیفے نے اتفاق کیا اور اللہ داد اور حکومت نے بھی - اور پھر سب اپنے اپنے لٹھ اور ٹوکے اور چھویاں اور گنڈاسے لے کر ، بارش میں بدن کی چربی تک بھیگتے ہوئے ، اپنے اپنے گھر کی طرف یہ کہتے ہوئے چل دئے : " بچ گیا سکھڑا -"

مراد کو نامراد لوٹتے دیکھ کر دور ، اندر ، چارپائی پہ بڑی ہوئی سلامتی نے ہاتھ مار کر دیئے کو بجھا دیا ۔ پھر اپنے بدن پہ اس دن کی آخری انگڑائی توڑی اور بولی :—

" شکر ہے اللہ ! "

(۱۰)

آج سورج نے چھدرے چھدرے بادلوں کے پیچھے اپنا منہ چھپا رکھا تھا ۔ آج آسمان کے کوٹلے پر کوئی نادار ، اپنی محنت سے شرمسار ، روتا ، کڑھتا ہؤا اپنی پھٹی پرانی چادر اوڑھ کے سو گیا تھا ۔

ہوائیں چلنے لگی تھیں جن کے دوش پہ لہراتے ہوئے کہیں لوب نار ، کوک نار ، اور پامیر اور ساپان کی طرف سے چھوٹے چھوٹے سفید پرندے آنے شروع ہوئے ۔ معلوم ہوتا تھا دور ، ہزاروں فرسنگ دور ، کہیں کھیلنے والے بچوں نے کاغذ کی کشتیاں ، وقت کے دھارے پہ چھوڑ دی ہیں یا ویشنو دیوی چھوٹی چھوٹی طشتریوں میں وہ سب نذرانے لوٹا رہی ہے جو صدیوں میں ، جاتریوں نے ڈھولکیاں اور چھینے بجا بجا کر ، امبا دیوی کی استتی گا گا کر اس کی خدمت میں پیش کیے تھے ۔

شب و روز بے اعتدال ہو رہے تھے ۔ راتیں دن پہ بھاری ہونے لگیں ۔ شکست خوردہ سورج شب کے سامنے شرمایا اور بادل کے پردے سے منہ نکال کر اپنی زمین کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا ۔ بس ، اس کے مسکرانے کی دیر تھی کہ تیتر کے پروں پہ رنگ بکھر گیا ۔ درآج وسار کی چال میں نئے انداز

چلے آئے اور نیم کی نازک سی ڈالی پہ جھولتی ، وزن درست کرتی ہوئی جھانپل کے گلے میں سے ایک مترنم اور مطیب بے اختیاری پھوٹ نکلی ۔ سورج نے نہ صرف جامن اور بکائن اور لنڈے پیپل کے پتوں سے صلح کی بلکہ ببول اور کنوار گندل کے بدن پہ اگے ہوئے کانٹوں کو بھی اپنا کہا اور زمین کے آنسو چوم چوم لیے ۔

کسانوں نے کہیں آنسوؤں کے بیج ، زمین کو زیرِ لب ، دبی دبی ہنسی ہنستے دیکھ لیا اور وارفتہ ہو کر اپنے اپنے ہل نکال لیے اور اس مست الست کاشت کو خریف کا نام دیا ۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک شہتوت کی کچی کنواری ڈالیاں توڑ لائے اور ان کی کمانیں بنا ، ان پہ چلّے چڑھا ، اِدھر اُدھر بے ربط سے تیر پھینکنے لگے ۔ مسجد میں مُلاؤں نے اور مندر میں پنڈتوں نے تماؤں کی شومیدہ کے گھوڑے چھوڑ دیے اور پوری کائنات ایک مسلسل نہ ختم ہونے والی جندہ بازی میں لگ گئی ۔

منگل نے اپنا ساز نکالا اور اس پر کلغی سجائی ۔ رانی نے تنور پر سے داہڑہ اٹھایا اور اس کے کچھ گیلے ہونے کی وجہ سے اس میں ڈھیر سی چیلیاں اور من چھٹی ڈال دی ۔ رات کی آمدنی سے ایک روپیہ نکال کر بڑی کو دیا تاکہ جاٹوں کے ہاں جا کر خالص گھی تُلوا کر لیتی آئے ۔ مدرسے میں بڑے بچوں کے شش ماہی امتحان ہو رہے تھے اس لیے چھوٹا چمن جہلم ارین کے ہاں مولیاں اور آلو لینے کے لیے پہنچا تو سلامتی سر کے گرد جالی کا

دوپٹہ باندھے بیٹھی تھی اور کہنیوں پہ آٹے کی چڑیاں لگائے۔

چنوں کو مولیاں اور آلو خریدتے دیکھ کر سلامتی بول اٹھی: "کیا بات ہے، چنیا؟ آج تمھارے آلو اور مولی کی روٹیاں پک رہی ہیں؟"

"روٹیاں نہیں، پراٹھے۔" چنوں نے اِتراتے ہوئے کہا: "ماں نے تنور تپایا ہے نا۔"

"ہائے ہائے وے" جہلم کہنے لگی، "تیری ماں نے تنور تپایا ہے؟"

"ہاں!" چنوں نے زور سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "تمھیں پراٹھے لگوانے ہوں تو آ جاؤ یا سلامتی کو بھیج دو۔"

پھر وہ سبزی لے کر چلا گیا اور پیچھے جہلم، عنایتی اور عائشہ ہنستی رہیں۔ سلامتی طبیعت کے خراب ہونے کی وجہ سے جلی بھنی سنتی رہی۔

پکتے ہوئے پراٹھوں میں سے خوشبو اٹھ رہی تھی اور اندر بیٹھے ہوئے حضور سنگھ اور جنداں کو للچا رہی تھی۔ حضور سنگھ سے نہ رہا گیا: "ذرا نرم لگانا بیٹی!" اس نے کہا۔ "میرے دانت کام نہیں کرتے۔" اور جنداں بھی نہ رہ سکی۔ بولی: "دیکھ تو، ہر وقت کھانے کی پڑی رہتی ہے۔"

رانو نے گھی میں بسے پراٹھے، نئے، صاف ستھرے جھاڑن میں باندھ کر منگل کی طرف بڑھا دیے۔ منگل نے مخمور سی

نگاہوں کے ساتھ رانو کی طرف دیکھا اور پھر اس کے کیچڑ سے بھرے آنگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا :

" بہت صفائی کرنی پڑے گی ؟ "

رانو نے دیکھتے ہوئے کہا : " ہاں ! " اور پھر ایک محجوب سی نگاہ منگل پر ڈالتے ہوئے بولی : " ہم عورتیں اور بنی کس لیے ہیں ؟ "

منگل نصیبوں والے اڈے کے لیے نکلنے ہی والا تھا کہ رانو کو کوئی بات یاد آ گئی اور وہ فوراً بول اٹھی : " ٹھہرو ! "

منگل وہیں رک گیا ۔ کچھ دیر میں رانی دوڑی ہوئی اس کے پاس آئی اور بولی : " مجھے دو شلواروں کا کپڑا لا دو ، تیوہار آ رہے ہیں ۔"

منگل نے ابھی جواب بھی نہ دیا تھا کہ رانو اپنے بدن پہ ، سامنے کی طرف اشارہ کرتی ہوئی ، کہنے لگی : " سب کے پاس یہ ہے ، میرے پاس ہی نہیں " اور پھر اوپر دیکھتے ہوئے وہ صرف مسکرائی نہیں ، کھل کھل کر کے ہنس اٹھی ۔

منگل نے تھوڑا سا سر ہلاتے ہوئے کہا : "اچھا ، دیکھو !"

" دیکھو ویکھو کچھ نہیں ۔" رانو نے بے جھجک کہہ دیا ۔ " میں کیا سب کے سامنے بنا شلوار کے پھروں گی اور پھر بولی : " میرا تو کچھ نہیں جاتا ۔"

منگل نے ایک دم اپنا سر ہلایا جیسے اپنے حق کو کسی

دوسرے سے خلط نہ کرنا چاہتا ہو ۔ رانو پھر کہنے لگی :
" چنوں کو اس کے گھر والے نے صوف کا سوٹ سلوا دیا ہے ۔ کیسا اچھا لگتا ہے ، اس کے گورے گورے پنڈے پر کالا کالا ، نرم نرم صوف ۔"

منگل سوچنے لگا ۔

رانو نے اور آگے ہو کر منگل کے آریب کرتے کا دامن تھام لیا اور بولی : " تم آج پھر پسرور نہیں تو گوجرانوالے ، نہیں سیالکوٹ سمبڑیال کی سواریاں ڈھونڈھ لینا ۔ بہے بھی قمیصیں مانگتے ہیں ۔"

منگل جیسے ایک دم فرمائشوں کے شیریں و ترش انبار کے نیچے دب گیا ۔ ساز میں سے کافی نیچے گر گئی جسے اٹھاتے پھر سے ساز میں ٹکاتے ہوئے اس نے رانی کی طرف دیکھا جو ابھی تک اس کا کرتا تھامے ہوئے تھی جیسے منگل اس کا چور تھا ، جیسے رانو کا کوئی قرض تھا جسے منگل کو چکانا تھا ۔

" اچھا بابا ، اچھا ۔" منگل نے اپنا کرتہ چھڑایا اور چل دیا ۔ رانی السائی سی کھڑی ، چوکھٹ میں جڑی ، ہمیشہ کی طرح اسے جاتے دیکھتی رہی ۔ اس کا مرد ، تکمیل اور تعمیل کی ایک رات اور آدھے ہی دن نے جس کی عمر میں دنوں ، مہینوں اور برسوں کا اضافہ کر دیا تھا ! پھر رانی اسے دیکھ کر ایکا ایکی ٹھٹک گئی ۔ تلوکا ! نہیں ، منگل ـــ منگل ! لیکن ،

ایک چادر میلی سی

یہ وہ منگل تو نہ تھا جسے ایک دن رانو نے دیکھا تھا ، جس دن چنوں نے اس پہ چادر ڈالنے کی بات کی تھی اور ایک البیلے پن میں وارث گاتے ہوئے جسے گلی کے لکڑ نے لپک لیا تھا ۔ آج وہ چپ تھا اور اس کے چوڑے چکلے کاندھے محبت کے بوجھ سے دب گئے تھے ، جس کے کارن وہ آپ ہی اپنا بڑا بھائی معلوم ہونے لگا تھا ۔

وہ جا رہا تھا اور گلی کے لکڑ جیسے پرے ہوگئے تھے۔ گاؤں سے باہر کے کالے کوس ایک دوسرے میں الجھ گئے تھے۔ الجھتے سلجھتے راستے کہیں بھی جاتے تھے لیکن ایک بات طے تھی کہ ان پہ اڑتی ہوئی دھول اور گرد ، کیچڑ اور غلاظت میں ہر منگل کا خون اور پسینہ رچا ہوا تھا ۔ پھر ، راستوں کے اس گورکھ دھندے میں ایک راستہ ضرور ایسا تھا جو ہر جانور ، ہر انسان کو سرِ شام "گھر" لے آتا تھا ۔

اپنی نگاہوں کے دھندلکے میں منگل کے حل ہوتے ہی رانی اندر لوٹ گئی ۔ آج اس کے پاؤں یقین سے زمین پہ پڑ رہے تھے۔ آج ہر چیز کتنی آسان ، کتنی سبک ہوگئی تھی جس کے مقابلے پہ اپنے کیچڑ سے لتھڑے آنگن کو صاف اور ستھرا اور پھر سے مہمان نواز بنانا کوئی محنت کی بات ہی نہ تھی ۔

(۱۱)

کسی کو اندازہ نہ تھا اب کے کوٹلے پہ اتنا جاتری پڑے گا ۔ کسی کو گمان بھی نہ تھا اب کے سامنے پہاڑوں پہ وقت سے پہلے برف پڑ جائے گی اور امبا دیوی سب بھگتوں کو کوٹلے کی طرف بھیج دے گی ، اور بسرور ، گوجرانوالہ ، سمبڑیال ، سیالکوٹ ، ستراہ اور ستوکی سے سواریاں آئیں گی ، لاریوں اور بسوں پر ، تانگوں اور اِکوں پر ، بیل گاڑیوں اور چھتناربون پر !

کسی کو معلوم نہ تھا کوٹلہ گاؤں کے لوگوں کے گھر دولت سے بھر جائیں گے اور ان پر دُھن برسنے لگے گا ۔ دیوانے شاہ کا سودا بک جائے گا اور جاٹ کا گھی ، خیرے کا تیل اور جہلم کی سبزی ۔ کبوتر مندر کے کلس سے گاؤں کی گلیوں میں اتر آئیں گے اور دانہ کھائیں گے اور ان کے بیار کی گھوں گھوں ، چوبیس گھنٹے چلنے والی آٹے کی مشین کی کُو کُو میں گم ہو جائے گی ، اور برات گھر ، دھرم شالہ اور ذیلداروں کی حویلی میں تل رکھنے کی جگہ نہ ہوگی اور لوگ دس دس ، بیس بیس روپے ایک یک کوٹھڑی کے دیں گے ۔ سنار کی بالیاں ، ٹھٹھیار کی تھالیاں ، براغ کے چوزے ، کھار کے کوزے ، سب بک جائیں گے اور ہڑپہ تہ رہے گا نہ محراب پر شہد کا چھتہ ۔ اور ابھی لوگ آ رہے

تھے ، ناچتے اور گاتے ، دف کوٹتے ، نفیری بجاتے : " بجانا ہے تو بجا لو ، امباجی ! پاپیوں کے بجانے کی یہی بیلا ہے ۔"

کوئی نہ جانتا تھا سال کے اس حصے میں کوٹلے کی عورتیں کیوں اوپر سے سوکھشم اور نیچے سے استھول ہو جاتی ہیں ؟ کوئی کہتا اس کی وجہ پچھلی گرمی ہے ، کوئی ، آنے والی سردی ، اور پھر وہ ہنسنے لگتے ۔ گاؤں کی گج گامنیاں ہاتھوں میں تھالی ، تھالی میں صدبرگ ، صدبرگ میں سیندور لیے مندر کی طرف چل نکلتیں اور اپنی ہی چال میں مست کہیں ایک کوٹلے پر تھم جاتیں تو گیان چند اور کیسر سنگھ ، رلدو اور دیوانے کی لبھیر چھوٹ جاتیں ۔ ان کے جاتے ہی وہ ہوش میں آ جاتے اور یک زبان ہو کر چلا اٹھتے : " ہوئے ہوئے ! "

آج ہی بڑی پرکرما کا دن تھا ۔ حضور سنگھ اور جنداں تک باہر گئے تھے ، لیکن رانو گھر ہی میں بیٹھی تھی ۔ اس کے کارن بڑی بھی نہ گئی تھی ۔ جوان جہان لڑکی اور اس پہ پرکرما کے لیے آئے ہوئے ہزاروں البیلے ، اس کی ایک انگلی بھی کسی کے حصے میں نہ آتی ۔ شلا پہ کوئی لال لال چیز پیس کر رانو اسے انگلی سے سمیٹتی ہوئی ایک کٹوری میں رکھ رہی تھی کھلے ہوئے بیسن میں ہری مرچ کی دم نظر آتی تھی اور آلو قتلے اور چولہے پہ کڑاہی چڑھی تھی جس میں سرسوں کا تیل آبل رہا تھا ۔

جب ہی چنوں کالے صوف کا سوٹ پہنے ، گلے میں گلابی دوپٹہ اڑاتی ہوئی اندر آئی ۔ کالی قمیص میں سے اس کا گورا گورا سینہ ، محبت اور کینہ لیے زندگی کا سیاہ و سفید سمجھا رہا تھا ۔

رانو کو چوکے اور صحن میں یوں کھم گڑی دیکھ کر چنوں بولی :

" ہائے ہائے نی خصم کھانیے ، آج کے دن تو گھر مری ہے؟"

رانی نے یونہی سا سر ہلا دیا ۔

چنوں اور پاس آتے ہوئے بولی : " باہر سب چھنڑیں (چنڈالیں) کھڑی تیری جان کو رو رہی ہیں اور تو یہاں کیا کر رہی ہے ؟ "

اور چنوں کی نظر رانو کی گابرے کی شلوار پر جا پڑی ۔

" یہ بات ! " چنوں نے اسے چھوتے ، سر ہلاتے ہوئے کہا ۔

رانو نے چنوں سے جان چھڑانے کے لیے کڑاھی میں پونی ڈال دی ۔ ہاتھ اوپر اٹھے تو چنوں کو رانو کے کرتے کے اندر کچھ اور ہی گول سڈول ، کچھ مخروطی سا نظر آیا ۔ اس نے بڑھ کر اوپر ہی سے کرتے میں ہاتھ ڈال دیا اور پھر فوراً ہی باہر نکال کر جھٹکنے لگی ۔ " ہائے میں مر گئی ! " وہ بولی ، جیسے جلتے ہوئے کوئلے چھو لیے ہوں ۔ " مالم ہوتا ہے منگل تیرے ساتھ سیدھا ہو گیا ! "

رانو کچھ نہ بولی ۔ دوسرے ہاتھ سے شلا پہ پسی ہوئی لال مری چیز کے چٹخارے لینے لگی ۔

" یہ کیا ؟ " چنوں نے پوچھا ۔

اور پھر اس نے غور سے دیکھا ۔ کھٹ مٹھی چٹنی تھی ۔ چنوں کی آنکھیں چوڑی ہو گئیں ۔ ایک انگلی سے اس نے بھی چٹنی کو منہ میں ڈال لیا اور سی سی کرتی ، آگے بڑھتی رانو کو شانوں سے جھنجھوڑتی ہوئی بولی : " ہائے ہائے نی ، رنڈیے ؟ !"

رانو ، اونہوں ، آنہاں کرتی ہوئی پیچھا چھڑانے لگی ۔

" سچ بتا " چنوں بولی " نہیں تو میرا مری کا منہ دیکھے۔ بتا ، تجھے میری سوگند ۔"

رانو نے کچھ کھور گھار کے بڑی کی طرف اشارہ کیا جو پکی نشانی تھی ۔ پھر چنوں کے کان کے پاس منہ کرتے ہوئے بولی : " ہا ہو ! "

چنوں ایک دم تھرک اٹھی ۔ ایک ہاتھ کولھے پر ، دوسرا سر پر رکھے ، وہ اپنے محور کے گرد گھوم گئی اور پھر ایکا ایکی باہر کی طرف لپکی — چلاتی ، پکارتی ہوئی : " نی سروہو ! نی چاچی ہورو! ودو نی ، اڑیے ، کہاں مر گئیں ساری کی ساری ؟"

جتنی تیزی سے چنوں باہر نکلی اتنی ہی تیزی سے منگل اندر آیا ۔ دروازے میں دونوں کی ٹکر ہو گئی ۔ چنوں دیوار کے ساتھ جا ٹکرائی ۔ منگل کی پگڑی پرے جا گری اور جوڑا کھل گیا ۔ اسے یوں دیکھ کر چنوں کچھ ہنستے ، کچھ خفا ہوتے ہوئے بولی :

" الدھا ! دکھائی نہیں دیتا ۔ پورا کوڑما ھی دھرت راشٹوں کا ھے ۔"

" پر ، چنوں ! " منگل نے پگڑی اٹھا کر بات شروع ھی کی تھی کہ چنوں بھاگ گئی ۔ منگل نے جوڑا لپیٹتے ، پگڑی پر سے گرد جھاڑتے ھوئے آواز دی : " رانو ! "

رانو سامنے ھی بیٹھی تھی لیکن چونک پڑی ۔ آج منگل نے پہلی بار اسے اس کے نام سے پکارا تھا ۔ وہ رانی بھی کہہ سکتا تھا لیکن ، " رانو ! " ضرور کوئی بات تھی ۔ رانو نے منگل کی طرف دیکھا جو اس کے پاس آ کر اکڑوں بیٹھ گیا تھا جیسے کوئی بڑے راز کی بات کہنا چاھتا ھو ۔

" سن ، رانو ، کال ھو گیا ۔ حد ھو گئی ۔"

رانی اندر ھی اندر مسکرا رھی تھی ، بولی : " پہلے تم کہہ لو ، پھر مجھے بھی تم سے کچھ کہنا ھے ۔"

" کیا کہنا ھے ؟ "

" پہلے تم کہہ لو ۔"

منگل کہنے ھی والا تھا کہ اس کی نگاہ بڑی پر جا پڑی جو دیوار کے پاس کھڑی تھی اور جس کی نگاہ باھر کی طرف تھی اور کان ماں باپ کی طرف ۔ اس کی طرف دیکھتے ھوئے منگل بڑے پیار سے بولا : " بیٹا ! تو اندر جا ۔"

بڑی ، چھوٹی سی ھو کر اندر چلی گئی ۔ منگل بولا :

"جاتریوں میں ایک لڑکا آیا ہے ، پچیس چھبیس برس کا ، گبھرو ، جوان ۔ ڈسکے کے متصدی کا بیٹا ۔ زمینیں ، مکان ، دکانیں ، جائداد ....."

رانی کے چہرے کی چمک ماند پڑ گئی اور وہ کہہ اٹھی :

" تب تو وہ ۔"

" ارے تُو سن تو " منگل بولا : " وہ کہتا ہے میں شادی کروں گا تو بڑی سے ، دنیا کی اور کسی لڑکی سے نہیں ۔"

" نہیں ۔" رانو نے ایک دم سب کام چھوڑ دیا ۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا ۔

" تیری قسم " منگل نے کہا ، اور اس نے آج پہلی بار رانو کی قسم کھائی تھی ۔ رانی کی سانس تیز ہونے لگی ۔ گابرے میں اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں ۔ مشکل سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولی :

" اس نے بڑی کو دیکھا ہے ؟ "

" ضرور دیکھا ہوگا ۔ شاید نہ بھی دیکھا ہو ۔"

" نہ دیکھا ، نہ ملا ، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے ؟"

" کیا معلوم ؟ " منگل بولا : " گاؤں کے پنچ بھی یہی چاہتے ہیں ، اور تُو تو جانتی ہے ، پنچوں میں پرمیشر ہوتا ہے ۔"

" ہاں ۔" رانی مان گئی ۔ " پنچوں میں پرمیشر نہ ہوتا تو میں آج کہاں ہوتی ؟ "

کچھ شہ پاتے ہوئے منگل جاری ہؤا : "وہ سب کہتے ہیں ، تیری بیٹی راج کرے گی ، رانی بنے گی ۔ مطلب ، تم ایسی رانی نہیں ، وہ ..... وہ جو اصلی ہوتی ہے ۔"

یہ سب کچھ رانی کے لیے ناقابل برداشت ہو رہا تھا لیکن منگل کہے جا رہا تھا : " وہ کچھ لینے دینے میں بھی نہیں ۔ اُلٹا سختی سے انکار کرتا ہے ۔" اور پھر ایکا ایکی کسی خیال کے آنے سے وہ کہہ اٹھا : " اس کا یہ مطلب نہیں ، میں کچھ دوں گا نہیں ۔ مجھ سے جو ہوگا ، دوں گا اپنی بیٹی کو ، پیچھے تھوڑی رکھ لوں گا ۔"

" اپنی بیٹی ! " رانو کے کانوں کو یقین نہ آ رہا تھا ۔

" میں تو اس کے لیے بک جاؤں گا ، رانو ۔" منگل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔ " چاہے اس کے لیے مجھے اِکا اور بکی کیوں نہ بیچنے پڑیں ۔"

جب ہی منگل کو کچھ یاد آیا : " تم بھی کچھ کہہ رہی تھیں ؟ "

" کچھ نہیں ۔" رانو بولی : " سرما دائی کو بلوا دو ۔ مجھے ابھی سے اس کے ساتھ بات پکی کرنی ہے ۔"

" سرما دائی ؟ " منگل نے دھرایا اور پھر آنکھیں پھیلاتے ہوئے رانی کی طرف دیکھنے لگا اور بولا : " سچ ؟ "

رانی نے خفیف سا سر ہلایا اور مسکراتے ، شرماتے ہوئے

پرے دیکھنے لگی ۔

اسی دم چنوں ، چاچی پورو ، بھابی ودیا ، جانکی ، سروپو ، چھوٹی رانی چنڈی ـــ عورتوں کا ایک غول کا غول اندر چلا آیا ، تالیاں بجاتا ، شور مچاتا ، ناچتا گاتا ہؤا :

" چوڑے والی بانہہ کڈھ کے
منڈا موہ لیا تویتاں والا "

(چوڑے والی بانہہ دکھا کر تعویزوں والا لڑکا موہ لیا—!)

" دمڑی دا سک مل کے
منڈا موہ لیا تویتاں والا "

(دمڑی کی چھال ہونٹوں پہ مل کر تعویزوں والا لڑکا موہ لیا!)

منگل نے انھیں چپ کرانے کے لیے ہاتھ اوپر کیا : "چنوں ، چاچی ! "

ہورن دئی نے آگے بڑھ کر زور سے منگل کو ایک دھکا دیا اور بولی : " جا وے جا ، بڑا آیا ہے ۔"

" لینگریڑا ۔" (دولھا) چنوں نے بھی دھکا دیا ۔

" دفان ہو جا ۔" ودیا بولی : " تیرا یہاں عورتوں میں کیا کام ؟ "

بے حیا ہورو بولی : " تیرا جو کام تھا تو نے کر دیا ۔ اب جا ، اِکا چلا ! " اور پھر رانو کی طرف دیکھتے ہوئے بولی : " لڑکا پیدا کرنا ری ۔ ایک اور مصیبت نہ کھڑی کر لینا ۔"

اور بھی عورتیں اندر آنے اور منگل کو دھکے دے دے کر باھر نکالنے لگیں ۔ رانو منگل کو بچاتے ہوئے رو بھی رہی تھی اور ہنس بھی رہی تھی : " ھائے ، ھائے نی ، رنڈیو ! ھائے نی ، میرا مرد ۔ نی بس کرو ، ھائے مار ھی ڈالو گی ؟ " اور منگل سر کو بازوؤں میں دے کر اپنی عزت بچاتا ہؤا ، لحہ بہ لحہ دروازے کے قریب ہوتا جا رہا تھا اور چلا رہا تھا : " چاچی ، چنوں ! جاتا ہوں ، میں جاتا ہوں ۔ میری توبہ ، میرے باپ کی توبہ " اور وہ گرتا پڑتا ، پگڑی سنبھالتا ہؤا باھر نکل گیا ۔

اب میدان عورتوں کے ھاتھ تھا ۔ وہ رانی کی طرف بانہیں اُلار اُلار کے گا رہی تھیں ، ناچ رہی تھیں :

" پودینے کی کرو کڑاھی رے
ھمارا اچھا کرارا پودینہ ، ھو !
مسالوں والا پودینہ ، ھو ! "

اور وہ پاگل ہو رہی تھیں ۔ ان کے گانے اور ناچ کی رفتار تھی کہ کم ہونے کی بجائے تیز ہوتی جا رہی تھی ۔ ان کے شور میں کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی تھی ۔ اس پر بھی رانو نے پورو کو پرے لے جا کر کہہ ھی دیا :

" بدھائی ہو ، چاچی ۔"

" بدھائی کس بات کی ؟ " پورن دئی نے اپنی ڈھیلی ہوتی

ہوئی دھوتی کو کستے ہوئے کہا :

" بڑی کے لیے بر مل گیا ! "

بڑی جو دروازے میں کھڑی تھی ، مرچ کی طرح لال ہو کر اندر سٹک گئی ، اور عورتیں ، جن کی نظروں کے افق پر ہمیشہ دولھے رہتے ہیں اور نیچے دلہنیں ، جن کے کان شہنائی کی آواز سننے کے لیے شہوانی ، آنکھیں براتیں دیکھنے کی متمنی ہوتی ہیں ، ایک دم بے خود اور پاگل ہو اٹھیں - ابھی سے انھیں بڑی کی برات دکھائی دینے لگی ، باجے کی آواز سنائی دینے لگی تھی - انھوں نے تو یہ بھی نہ پوچھا ، لڑکا کون ہے ؟ کہاں رہتا ہے ؟ کیا کام کرتا ہے ؟ انھیں تو زرتار سہرے لگائے ، سر پر کلغی سجائے ، ہاتھ میں تلوار لیے، گھوڑی پر چڑھا ہوا دولھا نظر آرہا تھا اور ساتھ جانوروں ، بندروں اور سوروں کی برات ، جو پھٹے پرانوں میں سے ان کا جوبن لوٹے جا رہی تھی اور اب وہ گا رہی تھیں :

" واڑ تھلے دو نمبو پکے
جیٹھ منگے آدھارے "

(باڑ کے نیچے دو نیمبو پکے ہیں - جیٹھ آدھار مانگ رہا ہے !)

" نہ میں جیٹھا ملے دیندی
نہ دیندی رکھوارے
ڈنڈیاں نوں ول پے گیا — جھمکے لین ہلارے"

(اے جیٹھ ! نہ میں مول دیتی ہوں ، نہ رکھنے کے لیے۔ نازک بالیوں کو ہل پڑ گیا ہے اور جھمکے جھولنے لگے ہیں ۔)

ایک اور نے شروع کیا :

" سوھریا بدام رنگیا !

لونہاں گوریاں ، پُتر تیرے کالے "

(اے بادام کے رنگ والے سسر ! تیری بہوئیں گوری ہیں لیکن) بیٹے کالے) ۔ وہ اپنے تصور میں دلیا بھر کی دلہنوں کو ن کی سسرال پہنچا چکی تھیں ۔

اس شور کی وجہ سے ، دیوی ماں کے درشنوں کے لیے آئی ھونی پوری پرکرما ، منگل کے گھر کی طرف پلٹ پڑی ۔ جیسے دیوی ماں مندر میں نہیں ، وہاں ہے یا جیسے مندر وہاں چلا یا ہے جہاں خلقت ہے ۔ گیان چند سرپنچ ، تارا سنگھ نمبردار ، ئیسر سنگھ ، جگو ، رلدو ، دیوانا ، کرمو ، دلا ، جمالا سب کر کھڑے ہو گئے ۔ کوٹھے پر عورتوں کے ٹھٹ نظر آنے گے ، نیچے مردوں کے ۔ اڑوس پڑوس اور باہر گاؤں کے لوگوں کے علاوہ سرما دانی بھی آئی تھی جو ساری دنیا کو دلیا میں ئی تھی اور اب اوروں کو بھی لانا چاہتی تھی ۔

جہلم کی تینوں بیٹیاں ، عنایتی ، عائشہ اور سلامتی بھی لی آئیں ۔ ساتھ جہلم کے بڑے بھائی کا لڑکا بھی تھا ، مولو ! س کے بے خود ، بے بس اشاروں کی طرف دیکھ کر سلامتی

شرما رہی تھی ، برسا رہی تھی - پھر نواب کی بیوی ، عائشہ ، گورو داس کی گن وتی ، سب اگلی پچھلی کدورتیں بھول کر اس لمحے میں کھو کھو گئیں -

پورو اور ودیا نے رانی کو بھی بیچ میں گھسیٹ لیا - ان سب کے درمیان ڈبو پاگل ہؤا گھوم رہا تھا - اِسے آسے ، سب کو سونگھ رہا تھا ، بے تحاشا دُم ہلا رہا تھا - رانو کچھ احتیاط ، کچھ بے احتیاطی سے ناچ رہی تھی - اس کے گبرے کی شلوار معلوم ہوتا تھا کوڑیالے رنگ کا کوئی سانپ ہے جو لپٹتا ، بل کھاتا ہؤا اوپر ہی اوپر جا رہا ہے - رانو ، جس کا مصیبت میں دبا ہؤا حسن آج تک کسی نے نہ دیکھا تھا ، پھانٹوں والے کرتے کے بیچ سے آنکھیں مارنے ، چندھیانے ، خیرہ کرنے لگا ، جیسے کوئی شیطان بچہ ہاتھ میں آئینہ لیے آتے جاتوں پر سورج کی روشنی کا عکس لپکائے ، ان کی آنکھیں چندھیائے ، بار بار الدھا کیے جائے -

ناچتی ہوئی عورتوں کی نگاہوں میں دنیا ایک وسیع و عریض دائرہ بن گئی جس کے بیچ مرد ، عورتیں ، بچے ، بوڑھے صرف خاکے تھے - پھر وہ بھی رنگ کے بڑے بڑے چھینٹوں اور دھبوں میں بدل گئے ، اور آخر ، ایک ہی رنگ رہ گیا — سورج کی کرنوں کا رنگ ، جس میں سب ہی رنگ چھپے رہتے ہیں اور الگ الگ پہچانے جانے کے لیے انسان کے دماغی

منشور کے محتاج و منتظر ۔

باہر کچھ اور ہی شور مچا اور یہ غول کا غول ، جھرمٹ کا جھرمٹ کئی نئے رنگ پیدا کرتا ، ایک دوسرے پر گرتا پڑتا دروازے پر ، کوٹھوں کی منڈیروں پر ، کنویں کے من پر پہنچ گیا ۔

یہ جاتری لوگ تھے جو سر جھکائے دیوی کی بھینٹیں گاتے ہوئے آ رہے تھے ۔ ڈھولک پیٹتے ، چھینے بجاتے ہوئے دیوی ماں کی استتی گا رہے تھے ۔ وہ سب کے سب اپنے اپنے گناہوں کا کفارہ کرنے چلے آئے تھے : گناہ ، جو ہو چکے تھے ؛ گناہ ، جو ہو رہے ہیں ؛ گناہ ، جو ہونے والے ہیں ۔

وہ ناچ رہے تھے ، گا رہے تھے ۔

" ماتا رانی دے دربار ، جوتاں جگدیاں
میا رانی ... ...
ہے میا ! تُسیں ستے بھیناں گوریاں
سر لال پُھلاں دیاں جوڑیاں
ماتا رانی دے دربار ، جوتاں جگدیاں ۔"

پھر منظر کھلا اور سب نے دیکھا چودھری مہربان داس اور اس کا بھائی گھنشام سات سال کی قید کاٹ کر آ رہے تھے ۔ شور مچاتے اور حال کھیلتے جاتریوں کے پیچھے بھیڑ میں ان کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں اور نگاہیں زمین پر گڑی ہوئی ، کربل سجدوں سے دوہری اور کان توبہ اور شرم سے

لال ۔ صدیوں کے خشوع اور خضوع کے بعد اب ان کے ہونٹوں پر چپ چلی آئی تھی اور ان کی یہ چپ داستانیں کہہ رہی تھی ۔

اور ان سب کے بیچ ایک لڑکا تھا ، پچیس چھبیس برس کا ، گبھرو ، جوان ، خوب صورت ، جو اس وقت بڑے آرام بڑے پیار ، بڑی ہی محبت اور عقیدت سے دیوی ماں کی بھینٹیں گا رہا تھا ۔ اسے دیکھ دیکھ کر لوگ حیران ہو رہے تھے ۔ سب کے ہونٹوں پر ایک ہی سوال تھا ، نگاہوں میں ایک ہی تجسس ۔ اتنی چھوٹی عمر میں ، اس لڑکے نے کون سا گناہ کیا تھا ؟ شاید اس نے گناہ نہیں ، گناہ نے اسے کیا تھا ۔

جب ہی بھیڑ کو چیرتا ، دھکے دیتا ، دھکے کھاتا ہؤا منگل رانی کے پاس چلا آیا اور اسے کندھے سے پکڑ کر ، جھنجھوڑتا ہؤا بولا : " رانو ! وہ ہے ..... وہ ہے لڑکا ۔" اور اس نے بھینٹیں گاتے ہوئے لڑکے کی طرف انگلی اٹھائی ۔

رانو نے دور سے اس خوب صورت لڑکے کی طرف دیکھا اور اس کی نگاہوں میں سوئمبر رچ گئے ۔ من ہی من میں اس نے بڑی کی بانہوں کے ہار اس کے گلے میں پہنا دیے اور خود اس بیل بنی اس سے لپٹ لپٹ گئی ۔ اتنا جوان ، اتنا سجیلا ، گبھرو نہ ملا ہوگا کسی ماں کی بیٹی کو ۔ محبت کے جوش میں دیوانی ہوتی ہوئی رانی نے پاس کھڑی چنوں کو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا اور زور سے اسے بھینچتے ، اس کی چیں بلاتے ہوئے بولی :

" ھائے نی چنوں ، میں تو ہار ہو گئی ....."

بڑی بھی عورتوں کے جھرمٹ میں سے سر نکال نکال کر لڑکے کو دیکھ رہی تھی ۔ آہا دھاپی کی اس بھیڑ نے اس کی سب شرموں کو چھپا لیا تھا ، لہو پورے بدن سے کھنچ کر اس کے منہ کو آنے لگا تھا ۔ وھی لہو سلامتی کے چہرے سے غائب ہو گیا اور وہ اپنی بڑی بہن سے کہنے لگی : " آپاں ، گھر چل ۔ میں تو تھک گئی ۔"

اور رانی بچوں کی طرح اپنے سب کو اپنا کھلونا دکھا رہی تھی : " دیکھا ، چاچی ؟ ودو تو بھی دیکھ ۔ دیکھ چنڈیئے ، لڈیئے ، لاجو....."

پورو چاچی نے دیکھا ، ودیا نے جانچا ، چنڈی نے تولا ۔ لاجو ، جانکی ، ککی ، اور رانی سب کی طرف دیکھتی ، سر جھٹکتی ہوئی بولی : " ہے نا ؟ "

جب ھی رانی کی نظروں کی کڑی ٹوٹ گئی ۔ اس نے دیکھا بچوں کے چہرے کا رنگ ایک دم زرد پڑ گیا تھا ۔ اسی بے چارے ، توریئے کے پھول کی طرح ۔ رانی نے ایک تیز سی نظر ان پہ ڈالتے ہوئے کہا : " ھائے نی ؟ " اور پھر اسی نظر سے لڑکے کی طرف دیکھنے لگی جو اب تک قریب آ چکا تھا اور نظروں کی جھولیاں پھیلائے ، ہاتھ جوڑے رانی سے کوئی بھیک مانگ رہا تھا ۔ رانی نے ایک دم سانس اوپر کھینچی : " میں مر گئی ! "

سانس باہر آنے سے پہلے ، رانی کے چہرے کی سرخی صاف اور سامنے پر لگا کر اڑتی ہوئی نظر آئی اور وہ روئی کی طرح سفید ہو گئی ، پہلے ہاتھ کانپے پھر پورے کا پورا بدن تشنجی ہو گیا اور وہ لڑکے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی : " وہی — یہ تو وہی ہے ، جس نے میرے ..... "

رانی اس ناگہانی صدمے سے بے ہوش ہو کر گرنے ہی والی تھی کہ صدیوں کے سترگ سے سفید اور سرافگندہ حضور سنگھ کہیں سے گرتا پڑتا چلا آیا اور قریب کھڑی جنداں بوڑی سے بے پروا ہو کر اس نے رانی کو گرنے سے تھام لیا ۔ آج اس کی آنکھیں جوہڑ پہ نہانے والے کبوتروں کی طرح پھڑپھڑانے کی بجائے ، پورے پر تول رہی تھیں ۔ شاہین صفت ، بلند آشیانوں کی طرف اڑ رہی تھیں ۔

" ہو " اس نے لرزتے کانپتے ہوئے ہونٹوں کے بیچ سے کہا :
" تو کسے روتی ہے ؟ میری طرف دیکھ ، جس نے بیٹا دیا ہے ، ہمیشہ بیٹا دیا ہے ، جب کہیں جا کے ایک بیٹا پایا ہے ۔ "

اور پھر ، بھورانی کی روح کو پا لینے کے جتن میں بڈھا حضور سنگھ خود کہیں کھو گیا ۔ اس کی آنکھوں کی گنگا جمنا ، اس کی داڑھی کے جنگل بیلوں میں گم ہو رہی تھیں ۔ تلوکے کی موت کے بعد آج تک اس کے ہاتھ ، کسی نہ ہاتھ آنے والی چیز کی تلاش میں کھپ گئے تھے ، آواز گلے میں کانپتی رہ گئی تھی ۔

" نہیوں لبھنے لال گواچے
مٹی نہ پھرول جوگیا ... "

جوگی ! بے کار کی خاک مت چھان ۔ لال جو ایک بار کھو گئے سو کھو گئے ۔ اب وہ تجھے نہیں ملیں گے ہاں ، لال کے بدلے تجھے لال مل جائیں گے ، ہیرے مل جائیں گے ، موتی ، بہتے ، پر وہ لال ؟ — نہیں ۔

جب ہی تو حضور سنگھ کی آنکھیں اس دنیا کے رشتوں اور بندھنوں میں کہیں رُل گئی تھیں اور نظارے اس کی بے بسی پر رو رہے تھے ۔ اب وہ خود نظارہ تھا اور خود ہی ناظر ، آپ تماشا اور آپ ہی تماشائی ۔ اس کے سر پہ گیروے رنگ کی پگڑی بندھی تھی جس کے بیچ کھل کھل جاتے تھے ۔ اس وقت پہلو سے وہ اپنی بھیگی ہوئی آنکھیں اور رکیک سی ناک ہونچھتا ہؤا کوئی جوگی ، کوئی رشتارام معلوم ہو رہا تھا ۔ وہ دنیا کو چھوڑ رہا تھا ۔ پر دنیا اسے نہیں چھوڑ رہی تھی ...آج موت کے دروازے پہ کھڑے اسے کوئی دبھ درشٹی مل گئی تھی اور وہ دیکھنے لگا تھا ۔ جنم ، مرن ، اور بیچ میں ایک رانی بہو ، جو شادی کے روز ، ایکا ایکی کہیں کتم عدم سے معرض وجود میں چلی آتی ہے اور پھلکاری کے پیچھے سے اپنی کلیروں سے آٹی ، لال لال چوڑیوں سے پٹی ، گوری گوری بانہیں نکالتی ، چھنکاتی ہے ، مہندی کی خوشبو سے بوجھل ہاتھ جوڑتی ، گھونگھٹ کی اوٹ سے ، نیم نگاہی کی زبان میں منتیں کرتی اپنے سسر سے کہتی ہے :
" پتاجی ! تو اپنا ایک یہ بیٹا دے دے مجھے ۔ میں اس کے بدلے

تجھے دس دوں گی ۔ اسی کی شکل میں ، اسی کی عقل میں ۔" اور بتامہ کہتا ہے : " ہاں ، ہاں ، بیٹی ! پر یہ بیٹا میرا ـــ ؟ " اور پھر وہ آنسو پونچھتا ہؤا منہ پھیر لیتا ہے ۔

رانی کے لانبے لانبے کیش ، حضور سنگھ کی انگلیوں سے اُمڈنے والی شفقت کے سیل میں نہا رہے تھے ، چھینٹے اُڑا رہے تھے ۔ آج اسے اپنے کھوئے ہوئے باپ کی جگہ کوئی آسمانی باپ مل گیا تھا ۔ اسی لیے ہر قسم کے رکھ رکھاؤ سے بے نیاز ، وہ بار بار اپنا سر اس کی چھاتی پہ پٹخ رہی تھی اور کہہ رہی تھی : " نہیں ... نہیں ، باپو ، یہ نہ ہوگا ۔ ہائے ! میری بیٹی ! میں مر جاؤں گی ، باپو ....."

اس وقت پرکرما کے لیے آئی ہوئی ۔ ساری خلقت تھم چکی اور رُکے ہوئے سانسوں سے ایک عظیم فیصلے کا انتظار کر رہی تھی ۔ معلوم ہوتا تھا رانی ہاں کہے گی تو دنیائیں بس جائیں گی اور نہ کہے گی تو پرلے (قیامت) آ جائے گی — مہاپرلے ، جس میں کیا انسان اور کیا حیوان ، کیا پشو اور کیا پنچھی ، کیا دھرتی اور کیا آکاش ، سب ناش ہو جائیں گے ۔ سمے کے پاس کوئی لوح نہ رہے گا اور خدا کے پاس کوئی روح ، شبد میں جھنکار نہ رہے گی ، جیوتی میں پرکاش نہ رہے گا : اور پنچ پرمشیور سامنے کھڑے ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر کوئی دعائیں مانگ رہے تھے اور ان کی دعاؤں میں یہ سیدھا سادا ، معصوم منگل بھی شامل ہوگیا تھا ۔

جب ہی رانی کو دلاسا دیتے ہوئے حضور سنگھ بولا :
"بینا ! یہ سب کیا ہو رہا ہے ؟ کیوں ہو رہا ہے ؟ اسے تُو نہیں جانتی ، نہ میں جانتا ہوں ، نہ یہ لوگ جانتے ہیں ۔ تُو اسے سمجھنے کی کوشش بھی مت کر ۔ ایک چپ ، یہاں تو دم مارنے کی جگہ نہیں ۔

رانی نے مڑ کر دیکھا ۔ بڑی کے چہرے پہ ہوائیاں اُڑ رہی تھیں ۔ وہ کہہ رہی تھی : "ماں ! تُو یہ کیا کر رہی ہے ؟ تُو نہ بولی تو میں بن بیائی دھرتی کی طرح بانجھ رہ جاؤں گی ۔" رانی نے سسر کے کاندھے پر سے سر اُٹھایا اور بولی :
"اچھا باپو ، اچھا ۔"

ایک دم بھینٹیں شروع ہو گئیں ۔ لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ گانے ، بجانے ، شور مچانے لگے ، جن کے بیچ رانی نے اُوپر ، مندر کی طرف دیکھا ۔ سنہرے کلسوں سے دیوی کا طلائی تبسم منعکس ہو کر رانی کے چہرے پر پڑ رہا تھا اور اسے منور کر رہا تھا ۔ تھوڑی ہی دیر میں رات ہوگئی اور اندھیرا چھا گیا ۔ اس پہ بھی ایک تیز ، چکاچوند کر دینے والی روشنی جو جھپک جھپک کر ، لپک لپک کر رانی کی طرف آ رہی تھی اور جس نے پوری طرح سے اس کے بدن کا احاطہ کر لیا تھا ۔ اسی دم مندر میں گھنٹیوں کا غوغا مچا ، مسجد سے اذان بلند ہوئی اور جہاں کہیں تھے وہاں اندھیرے میں کسی

ایک چادر میلی سی

کے ہاتھ پھیلے اور گردن لٹکتی ہوئی نظر آئی ۔

ایک ڈر تھا ، اور ایک حظ بھی ، جن میں سنسناتی ہوئی رانو نے اپنے دونوں ہاتھ کاسوں کی طرف اُٹھا دیے اور روتی دھوتی ، لرزتی کانپتی ہوئی بولی :

"ماں ! ہے دیوی ماں !"

جب ہی ودیا نے پورو کی کمر میں ٹہوکا دیا :
"انیے پورو ! سب ہی آئے ، ایک تیرا دھرم داس نہیں آیا ؟"

اور پورو جھوٹ موٹ روتی ہوئی اپنے شمبھو کے حرامی باپ کا ماتم کرنے لگی !